اصلاحی خطبات

جلد ۱۰

- پریشانیوں کا علاج
- دوستی اور دشمنی میں اعتدال
- بڑے کا اکرام کیجئے
- رزقِ حلال کی طلب
- تعلقات کو نبھائیے
- رمضان کس طرح گزاریں؟
- بُری حکومت کی نشانیاں
- استخارہ کا مسنون طریقہ
- غلط نسبت سے بچئے
- احسان کا بدلہ احسان

حضرت مولانا مُفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

اصلاحی خطبات

۱۰

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب	حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم
ضبط وترتیب	مولانا محمد عبداللہ میمن صاحب
تاریخ اشاعت	نومبر ۱۹۹۹ء
مقام	جامع مسجد بیت المکرم، گلشن اقبال، کراچی
باہتمام	ولی اللہ میمن ۴۹۱۶۰۳۳
ناشر	میمن اسلامک پبلشرز
کمپوزنگ	عبدالماجد پراچہ (فون: 0333-2110941)
قیمت	/- روپے

ملنے کے پتے

- میمن اسلامک پبلشرز، ۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹
- دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
- مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
- ادارۃ المعارف، دارالعلوم کراچی ۱۴
- کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال، کراچی
- اقبال بک سینٹر صدر کراچی
- مکتبۃ الاسلام، الٰہی فلور مل، کورنگی، کراچی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ط

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

الحمدللّٰہ و کفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ امابعد!

اپنے بعض بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل میں احقر کئی سال سے جمعہ کے روز عصر کے بعد جامع مسجد البیت المکرّم گلشن اقبال کراچی میں اپنے اور سننے والوں کے فائدے کے لئے کچھ دین کی باتیں کیا کرتا ہے۔ اس مجلس میں ہر طبقہ خیال کے حضرات اور خواتین شریک ہوتے ہیں، الحمد للہ احقر کو ذاتی طور پر بھی اس کا فائدہ ہوتا ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ سامعین بھی فائدہ محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو ہم سب کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں۔ آمین۔

احقر کے معاون خصوصی مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہ نے کچھ عرصے سے احقر کے ان بیانات کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کر کے ان کے کیسٹ تیار کرنے اور ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جس کے بارے میں دوستوں سے معلوم ہوا کہ بفضلہٖ تعالیٰ ان سے بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

ان کیسٹوں کی تعداد اب تین سو سے زائد ہوگئی ہے۔ انہی میں سے کچھ کیسٹوں کی تقاریر مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہ نے قلمبند بھی فرمالیں اور ان کو

چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شائع کیا۔ اب وہ ان تقاریر کا مجموعہ ''اصلاحی خطبات'' کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔

ان میں سے بعض تقاریر پر احقر نے نظر ثانی بھی کی ہے۔ اور موصوف نے ان پر ایک مفید کام یہ بھی کیا ہے کہ تقاریر میں جو احادیث آتی ہیں، ان کی تخریج کر کے ان کے حوالے بھی درج کر دیئے ہیں، اور اس طرح ان کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ تقریروں کی تلخیص ہے جو کیسٹوں کی مدد سے تیار کی گئی ہے، لہٰذا اس کا اسلوب تحریری نہیں، بلکہ خطابی ہے۔ اگر کسی مسلمان کو ان باتوں سے فائدہ پہنچے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور اگر کوئی بات غیر محتاط یا غیر مفید ہے، تو وہ یقیناً احقر کی کسی غلطی یا کوتاہی کی وجہ سے ہے۔ لیکن الحمدللہ ان بیانات کا مقصد تقریر برائے تقریر نہیں، بلکہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اور پھر سامعین کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

نہ بہ حرف ساختہ سرخوشم، نہ بہ نقش بستہ مشوشم
نفسے بیاد بیاد تو می زنم، چہ عبارت وچہ معانیم

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان خطبات کو خود احقر کی اور تمام قارئین کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں، اور یہ ہم سب کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے مزید دعا ہے کہ وہ ان خطبات کے مرتب اور ناشر کو بھی اس خدمت کا بہترین صلہ عطا فرمائیں آمین۔

محمد تقی عثمانی

دارالعلوم کراچی ۱۴

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

عرضِ ناشر

الحمد للہ ''اصلاحی خطبات'' کی دسویں جلد آپ تک پہنچانے کی ہم سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ نویں جلد کی مقبولیت اور افادیت کے بعد مختلف حضرات کی طرف سے دسویں جلد کو جلد از جلد شائع کرنے کا شدید تقاضہ ہوا، اور اب الحمدللہ، دن رات کی محنت اور کوشش کے نتیجے میں صرف چند ماہ کے اندر یہ جلد تیار ہو کر سامنے آ گئی اس جلد کی تیاری میں برادر مکرم جناب مولانا عبداللہ میمن صاحب نے اپنی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس کام کے لئے اپنا قیمتی وقت نکالا، اور دن رات کی انتھک محنت اور کوشش کر کے دسویں جلد کے لئے مواد تیار کیا، اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور عمر میں برکت عطا فرمائے اور مزید آگے کام جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ہم جامعہ دارالعلوم کراچی کے استاد حدیث جناب مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم اور مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مدظلہم کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس پر نظر ثانی فرمائی، اور مفید مشورے دیئے، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ان حضرات کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

تمام قارئین سے دعاء کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو مزید آگے جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے، اور اس کے لئے وسائل اور اسباب میں آسانی پیدا فرمائے۔ اس کام کو اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ولی اللہ میمن

اجمالی فہرست
جلد ۱۰

عنوان	صفحہ نمبر

فہرستِ مضامین

پریشانیوں کا علاج

رمضان کس طرح گزاریں؟

صفحہ نمبر	عنوان

دوستی اور دشمنی میں اعتدال

تعلقات کو نبھائیں

صفحہ نمبر	عنوان

بحث ومباحثہ اور جھوٹ ترک کیجئے

عنوان	صفحہ نمبر
دین سیکھنے سکھانے کا طریقہ	

استخارہ کا مسنون طریقہ

رزقِ حلال طلب کریں

تعلیم قرآن کی اہمیت

پریشانیوں کا علاج

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پریشانیوں کا علاج

الحمد للّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده اللّٰه فلا مضلّ له ومن يضلله فلا هادى له، ونشهد أن لا اله إلا اللّٰه وحده لاشريک لهٗ ونشهدأن سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسولهٗ صلى اللّٰه تعالٰى عليه وعلٰى اٰله وأصحابه وبارک وسلم تسليمًا كثيرًا كثيراً۔

امابعد!

عن عبداللّٰه بن ابى اوفى رضى اللّٰه تعالٰى عنه قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من كانت له الى اللّٰه حاجة او الى احد من بنى آدم فليتوضأو ليحسن الوضوء ثم ليصل ركعتين ثم ليثن على اللّٰه تبارک وتعالٰى وليصل على النبى صلى اللّٰه عليه وسلم، ثم ليقل: لا اله الا اللّٰه الحليم الكريم، سبحان اللّٰه رب العرش العظيم، الحمدللّٰه رب العٰلمين، اسألک موجبات رحمتک وعزائم مغفرتک والغنيمة من كل بر والسلامة من كل اثم لا تدع لنا ذنبا الا غفرته، ولا همًّا الا فرجته ولا حاجة هى لک رضى الا قضيتها يا ارحم الراحمين۔ (ترمذی، کتاب الصلٰوۃ، باب ماجاء فی صلاۃ الحاجۃ)

تمہید

یہ حدیث حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فقہاء صحابہ میں سے ہیں۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو اللہ تعالیٰ سے کوئی ضرورت پیش آئے یا کسی آدمی سے کوئی کام پیش آجائے تو اس کو چاہئے کہ وہ وضو کرے اور اچھی طرح سُنّت کے مطابق تمام آداب کے ساتھ وضو کرے، پھر دو رکعتیں پڑھے اور پھر دو رکعت پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرے اور پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور پھر دعا کے یہ کلمات کہے۔ (کلمات اوپر حدیث میں موجود ہیں)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس نماز کا طریقہ بیان فرمایا ہے جس کو عرف عام میں "صلوٰۃ الحاجۃ" کہا جاتا ہے۔ یعنی "نمازِ حاجت"۔ جب بھی کسی شخص کو کوئی ضرورت پیش آئے یا کوئی پریشانی لاحق ہوجائے یا کوئی کام کرنا چاہتا ہو لیکن وہ کام ہوتا نظر نہ آرہا ہو یا اس کام کے ہونے میں رکاوٹیں ہوں تو اس صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کو یہ تلقین فرمائی کہ وہ "نمازِ حاجت" پڑھے، اور نمازِ حاجت پڑھنے کے بعد "دعائے حاجت" پڑھے، اور پھر اپنا جو مقصد ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ امید ہے کہ اگر اس کام میں خیر ہوگی تو انشاء اللہ وہ کام ضرور انجام پاجائے گا۔ لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت یہ ہے کہ ضرورت کے وقت نمازِ حاجت پڑھی جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

ایک مسلمان اور کافر میں فرق

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ

ظاہری اسباب اور دنیاوی اسباب تو اختیار کرتا ہے اور شرعاً ان اسباب کو اختیار کرنے کی اجازت بھی ہے، لیکن ایک مسلمان اور ایک کافر کے درمیان یہی فرق ہے کہ جب ایک کافر دنیا کے ظاہری اسباب اختیار کرتا ہے تو وہ انہی اسباب پر بھروسہ کرتا ہے کہ جو اسباب میں اختیار کر رہا ہوں، انہی اسباب کے ذریعہ میرا کام بن جائے گا۔

ملازمت کے لئے کوشش

مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص بے روزگار ہے اور اس بات کے لئے کوشش کر رہا ہے کہ مجھے اچھی ملازمت مل جائے، اب ملازمت حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ جگہیں تلاش کرے، اور جہاں کہیں ملازمت ملنے کا امکان ہو وہاں درخواست دے، اور اگر کوئی جاننے والا ہے تو اس سے اپنے حق میں سفارش کروائے وغیرہ۔ یہ سب ظاہری اسباب ہیں۔ اب ایک کافر سارا بھروسہ انہی ظاہری اسباب پر کرتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ درخواست ٹھیک طریقے سے لکھ دوں، سفارش اچھی کرادوں اور تمام ظاہری اسباب اختیار کرلوں اور بس۔ اس کی پوری نگاہ اور پورا بھروسہ انہی اسباب پر ہے۔ یہ کام کافر کا ہے۔

اور مسلمان کا کام یہ ہے کہ اسباب تو وہ بھی اختیار کرتا ہے، درخواست وہ بھی دیتا ہے، اور اگر سفارش کی ضرورت ہے تو جائز طریقے سے وہ سفارش بھی کراتا ہے، لیکن اس کی نگاہ ان اسباب پر نہیں ہوتی، وہ جانتا ہے کہ نہ یہ درخواست کچھ کر سکتی ہے اور نہ یہ سفارش کچھ کر سکتی ہے، کسی مخلوق کی قدرت اور اختیار میں کوئی چیز نہیں، ان اسباب کے اندر تاثیر پیدا کرنے والی ذات اللہ جل جلالہ کی ذات ہے، وہ مسلمان تمام اسباب اختیار کرنے کے بعد اسی ذات سے مانگتا ہے کہ یا اللہ! ان اسباب کو اختیار کرنا آپ کا حکم تھا، میں نے یہ اسباب اختیار کرلئے، لیکن ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والے آپ ہیں، میں آپ ہی سے مانگتا ہوں کہ آپ میری یہ مراد پوری فرمادیجئے۔

بیمار آدمی کی تدابیر

مثلاً ایک شخص بیمار ہوگیا، اب ظاہری اسباب یہ ہیں کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جائے اور جو دوا وہ تجویز کرے وہ دوا استعمال کرے، جو تدبیر وہ بتائے وہ تدبیر اختیار کرے، یہ سب ظاہری اسباب ہیں۔ لیکن ایک کافر شخص جس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ہے، وہ سارا بھروسہ ان دواؤں اور تدبیروں پر کرے گا، ڈاکٹر پر کرے گا، البتہ ایک مؤمن بندے کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی کہ تم دوا اور تدبیر ضرور کرو، لیکن تمہارا بھروسہ ان دواؤں اور تدبیروں پر نہ ہونا چاہئے بلکہ تمہارا بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ کی ذات شفا دینے والی ہے۔ اگر وہ ذات ان دواؤں اور تدبیروں میں تاثیر نہ ڈالیں تو پھر ان دواؤں اور تدبیروں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ ایک ہی دوا، ایک ہی بیماری میں ایک انسان کو فائدہ پہنچارہی ہے، لیکن وہی دوا اسی بیماری میں دوسرے انسان کو نقصان پہنچارہی ہے۔ اس لئے کہ درحقیقت دوا میں تاثیر پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو مٹی کی ایک چٹکی میں تاثیر عطا فرمادیں، اگر وہ تاثیر عطا نہ فرمائیں تو بڑی سے بڑی دوا اور مہنگی سے مہنگی دوا میں تاثیر عطا نہ فرمائیں۔

لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ اسباب ضرور اختیار کرو لیکن تمہارا بھروسہ ان اسباب پر نہ ہونا چاہئے، بلکہ بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ہونا چاہئے، اور ان اسباب کو اختیار کرنے کے بعد یہ دعا کرو کہ یا اللہ! جو کچھ میرے بس میں تھا اور جو ظاہری تدابیر اختیار کرنا میرے اختیار میں تھا وہ میں نے کرلیا، لیکن یا اللہ! ان تدابیر میں تاثیر پیدا کرنے والے آپ ہیں، ان تدابیر کو کامیاب بنانے والے آپ ہیں، آپ ہی ان میں تاثیر عطا فرمایئے اور آپ ہی ان کو کامیاب بنایئے۔

تدبیر کے ساتھ دعا

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کا ایک عجیب اور خوبصورت جملہ منقول ہے کہ جب بھی آپ کسی کام کی کوئی تدبیر فرماتے، چاہے دعا کی ہی تدبیر فرماتے تو اس تدبیر کے بعد یہ جملہ ارشاد فرماتے۔

﴿اللهم هذا الجهد وعليك التكلان﴾

(ترمذی، ابواب الدعوات، باب نمبر ۳۰)

یا اللہ! میری طاقت میں جو کچھ تھا وہ میں نے اختیار کرلیا، لیکن بھروسہ آپ کی ذات پر ہے، آپ ہی اپنی رحمت سے اس مقصد کو پورا فرمادیجئے۔

زاویہ نگاہ بدل دو

یہی وہ بات ہے جو ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ دین درحقیقت زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، بس ذرا سا زاویہ نگاہ بدل لو تو دین ہوگیا، اور اگر زاویہ نگاہ نہ بدلو تو وہی دنیا ہے، مثلاً ہر مذہب یہ کہتا ہے کہ جب بیماری آئے تو علاج کرو، اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ بیمار ہونے پر علاج کرو، لیکن بس زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا فرق ہے، وہ یہ کہ علاج ضرور کرو لیکن بھروسہ اس علاج پر مت کرو بلکہ بھروسہ اللہ جلّ جلالہ کی ذات پر کرو۔

"ھوالشافی" نسخہ پر لکھنا

اسی وجہ سے اس زمانہ میں مسلمان اطباء کا یہ طریقہ تھا کہ جب وہ کسی مریض کا نسخہ لکھتے تو سب سے پہلے نسخہ کے اوپر "ھوالشافی" لکھا کرتے تھے یعنی شفاء دینے والا اللہ ہے۔ یہ "ھوالشافی" لکھنا ایک اسلامی طریقہ کار تھا۔ اس زمانے میں انسان

کے ہر ہر نقل و حرکت اور ہر ہر قول و فعل میں اسلامی ذہنیت، اسلامی عقیدہ اور اسلامی تعلیمات منعکس ہوتی تھیں۔ ایک طبیب ہے جو علاج کر رہا ہے لیکن نسخہ لکھنے سے پہلے اس نے "ھوالشافی" لکھ دیا، یہ لکھ کر اس نے اس بات کا اعلان کر دیا کہ میں اس بیماری کا نسخہ تو لکھ رہا ہوں لیکن یہ نسخہ اس وقت تک کار آمد نہیں ہوگا جب تک وہ شفا دینے والا شفا نہیں دے گا۔ ایک مؤمن ڈاکٹر اور طبیب پہلے ہی قدم پر اس کا اعتراف کر لیتا تھا، اور جب "ھوالشافی" کا اعتراف کر کے نسخہ لکھتا تو اس کا نسخہ لکھنا بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کا ایک حصہ بن جاتا تھا۔

مغربی تہذیب کی لعنت کا اثر

لیکن جب سے ہمارے اوپر مغربی تہذیب کی لعنت مسلط ہوئی ہے، اس وقت سے اس نے ہمارے اسلامی شعائر کا ملیا میٹ کر ڈالا۔ اب آج کل کے ڈاکٹر کو نسخہ لکھتے وقت نہ "بسم اللہ" لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ "ھوالشافی" لکھنے کی ضرورت ہے، بس اس نے تو مریض کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھنا شروع کر دیا، اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ سائنس ہمارے پاس ایسے کافروں کے واسطے سے پہنچی ہے جن کے دماغ میں اللہ تعالیٰ کے شافی ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں۔ ان کا سارا بھروسہ اور اعتماد انہی اسباب اور انہی تدابیر پر ہے، اس لئے وہ صرف تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

اسلامی شعائر کی حفاظت

اللہ تعالیٰ نے سائنس کو حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی، سائنس کسی قوم کی میراث نہیں ہوا کرتی، علم کسی قوم اور مذہب کی میراث نہیں ہوتی، مسلمان بھی سائنس ضرور حاصل کرے، لیکن اپنے اسلامی شعائر کو تو محفوظ رکھے اور اپنے

دین و ایمان کی تو حفاظت کرے، اپنے عقیدہ کی کوئی جھلک تو اس کے اندر داخل کرے۔ یہ تو نہیں ہے کہ جو شخص ڈاکٹر بن گیا اس کے لئے "ھوالشافی" لکھنا حرام ہوگیا، اب اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے "شافی" ہونے کے عقیدے کا اعلان کرنا ناجائز ہوگیا، اور وہ ڈاکٹر یہ سوچنے لگے کہ اگر میں نے نسخہ کے اوپر "ھوالشافی" لکھ دیا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ "بیک ورڈ" آدمی ہے، بہت پسماندہ ہے، اور یہ لکھنا تو ڈاکٹری کے اصول کے خلاف ہے۔ ارے بھائی! اگر تم ڈاکٹر ہو تو ایک مسلمان ڈاکٹر ہو، اللہ جل جلالہ پر ایمان رکھنے والے ہو، لہٰذا تم اس بات کا پہلے ہی اعلان کردو کہ جو کچھ تدبیر ہم کر رہے ہیں یہ ساری تدبیر اللہ جل جلالہ کی تاثیر کے بغیر بیکار ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

تدبیر کے خلاف کام کا نام "اتفاق"

بڑے بڑے ڈاکٹر، اطباء اور معالجین روزانہ اللہ جل جلالہ کی تاثیر اور فیصلوں کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہم تدبیر کچھ کر رہے تھے مگر اچانک کیا سے کیا ہوگیا، اور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ ہماری ظاہری سائنس سب بیکار ہوگئی۔ لیکن اس اچانک اور ان کی ظاہری سائنس کے خلاف پیش آنے والے واقعہ کو "اتفاق" کا نام دے دیتے ہیں کہ اتفاقاً ایسا ہوگیا۔

کوئی کام "اتفاقی" نہیں

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کی دنیا جس کو "اتفاق" کا نام دیتی ہے کہ اتفاقاً یہ کام اس طرح ہوگیا، یہ سب غلط ہے۔ اس لئے کہ اس کائنات میں کوئی کام اتفاقاً نہیں ہوتا بلکہ اس کائنات کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی حکمت، مشیت اور نظم کے ماتحت ہوتا ہے۔ جب

کسی کام کی علت اور سبب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کام کن اسباب کی وجہ سے ہوا تو بس ہم کہہ دیتے ہیں کہ اتفاقاً یہ کام اس طرح ہوگیا۔ ارے جو اس کائنات کا مالک اور خالق ہے وہی اس پورے نظام کو چلارہا ہے اور ہر کام پورے مستحکم نظام کے تحت ہورہا ہے، کوئی ذرہ اس کی مشیت کے بغیر ہل نہیں سکتا، اس لئے سیدھی سی بات یہ ہے کہ اس دوا میں بذاتِ خود کوئی تاثیر نہیں تھی، جب اللہ تعالیٰ نے اس دوا میں تاثیر پیدا فرمائی تھی تو فائدہ ہوگیا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے تاثیر پیدا نہیں فرمائی، تو اس دوا سے فائدہ نہیں ہوا۔ بس یہ سیدھی سی بات ہے "اتفاق" کا کیا مطلب؟

مسبّب الاسباب پر نظر ہو

بس انسان یہی زاویہ نگاہ بدل لے کہ تدبیروں اور اسباب پر بھروسہ نہ ہو، بلکہ مسبّب الاسباب پر بھروسہ ہو کہ وہ سب کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف تدبیر اختیار کرنے کی اجازت دی بلکہ تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیا کہ تدبیر اختیار کرو اور ان اسباب کو اختیار کرو، اس لئے کہ ہم نے ہی یہ اسباب تمہارے لئے پیدا کئے ہیں۔ لیکن تمہارا امتحان یہ ہے کہ آیا تمہاری نگاہ ان اسباب کی حد تک محدود رہ جاتی ہے یا ان اسباب کے پیدا کرنے والے پر بھی جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دلوں میں یہ عقیدہ اس طرح پیوست فرمادیا تھا کہ ان کی نگاہ ہمیشہ مسبّب الاسباب پر رہتی تھی۔ صحابۂ کرامؓ اسباب کو صرف اس وجہ سے اختیار کرتے تھے کہ ہمیں اسباب اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین اور بھروسہ حاصل ہوجاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے عجیب و غریب کرشمے بندے کو دکھاتے ہیں۔

حضرت خالد بن ولید ؓ کا زہر پینا

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ شام کے ایک قلعے کا محاصرہ کیا ہوا تھا، قلعہ کے لوگ محاصرہ سے تنگ آ گئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ صلح ہو جائے۔ لہٰذا ان لوگوں نے قلعے کے سردار کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس صلح کی بات چیت کے لئے بھیجا۔ چنانچہ ان کا سردار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں آیا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی شیشی ہے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے پوچھا کہ یہ شیشی میں کیا ہے اور کیوں لے کر آئے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اس شیشی میں زہر بھرا ہوا ہے اور یہ سوچ کر آیا ہوں کہ اگر آپ سے صلح کی بات چیت کامیاب ہو گئی تو ٹھیک، اور اگر بات چیت ناکام ہو گئی اور صلح نہ ہو سکی تو ناکامی کا منہ لے کر اپنی قوم کے پاس واپس نہیں جاؤں گا بلکہ یہ زہر پی کر خودکشی کر لونگا۔

تمام صحابۂ کرامؓ کا اصل کام تو لوگوں کو دین کی دعوت دینا ہوتا تھا، اس لئے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوچا کہ اس کو اس وقت دین کی دعوت دینے کا اچھا موقع ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سردار سے پوچھا: کیا تمہیں اس زہر پر اتنا بھروسہ ہے کہ جیسے ہی تم یہ زہر پیوسگے تو فوراً موت واقع ہو جائے گی؟ اس سردار نے جواب دیا کہ ہاں مجھے اس پر بھروسہ ہے، اس لئے کہ یہ ایسا سخت زہر ہے کہ اس کے بارے میں معالجین کا کہنا یہ ہے کہ آج تک کوئی شخص اس زہر کا ذائقہ نہیں بتا سکا، کیونکہ جیسے ہی کوئی شخص یہ زہر کھاتا ہے تو فوراً اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، اس کو اتنی مہلت نہیں ملتی کہ وہ اس کا ذائقہ بتا سکے۔ اس وجہ سے مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس کو پی لوں گا تو فوراً مر جاؤں گا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سردار سے کہا کہ یہ زہر کی

شیشی جس پر تمہیں اتنا یقین ہے، یہ ذرا مجھے دو۔ اس نے وہ شیشی آپ کو دے دی۔ آپ نے وہ شیشی اپنے ہاتھ میں لی اور پھر فرمایا کہ اس کائنات کی کسی چیز میں کوئی تاثیر نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ اس کے اندر اثر نہ پیدا فرمادیں، میں اللہ کا نام لے کر اور یہ دعا پڑھ کر بسم اللّٰہ الذی لایضر مع اسمه شئی فی الارض ولا فی السمآء وهو السمیع العلیم (اس اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جس کے نام کے ساتھ کوئی چیز نقصان نہیں پہنچاسکتی، نہ آسمان میں اور نہ زمین میں، وہی سننے اور جاننے والا ہے) میں اس زہر کو پیتا ہوں، آپ دیکھنا کہ مجھے موت آتی ہے یا نہیں۔ اس سردار نے کہا کہ جناب! یہ آپ اپنے اوپر ظلم کررہے ہیں، یہ زہر تو اتنا سخت ہے کہ اگر انسان تھوڑا سا بھی منہ میں ڈال لے تو ختم ہوجاتا ہے اور آپ نے پوری شیشی پینے کا ارادہ کرلیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: انشاء اللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ دعا پڑھ کر وہ زہر کی پوری شیشی پی گئے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانا تھا۔ اس سردار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری شیشی پی گئے لیکن ان پر موت کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے، وہ سردار یہ کرشمہ دیکھ کر مسلمان ہوگیا۔

ہر کام میں مشیت خداوندی

بہرحال، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں یہ عقیدہ جما ہوا تھا کہ جو کچھ اس کائنات میں ہورہا ہے وہ اللہ جل شانہ کی مشیت سے ہورہا ہے ان کی مشیت کے بغیر کوئی ذرہ حرکت نہیں کرسکتا۔ یہ عقیدہ ان کے دلوں میں اس طرح پیوست ہوچکا تھا کہ اس کے بعد یہ تمام اسباب بے حقیقت نظر آرہے تھے۔ اور جب آدمی اس ایمان و یقین کے ساتھ کام کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی قدرت کے کرشمے بھی دکھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی سُنّت یہ ہے کہ تم اسباب پر جتنا بھروسہ کروگے، اتنا ہی ہم تمہیں اسباب کے ساتھ باندھ دیں گے، اور جتنا تم اس کی

ذات پر بھروسہ کروگے تو اتنا ہی اللہ تعالیٰ تم کو اسباب سے بے نیاز کر کے تمہیں اپنی قدرت کے کرشمے دکھائیں گے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حالات میں قدم قدم پر یہ چیز نظر آتی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے، راستے میں ایک منزل پر قیام فرمایا اور وہاں ایک درخت کے نیچے آپ تن تنہا سوگئے، آپ کے قریب کوئی محافظ اور کوئی نگہبان نہیں تھا، کسی کافر نے آپ کو تنہا دیکھا تو تلوار سونت کر آگیا اور بالکل آپ کے سر پر آکر کھڑا ہوگیا، جب آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے دیکھا کہ اس کافر کے ہاتھ میں تلوار ہے اور آپ نہتے ہیں اور وہ کافر یہ کہہ رہا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ اس شخص کو یہ خیال تھا کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دیکھیں گے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور میں نہتا ہوں اور اچانک یہ شخص میرے سر پر آکھڑا ہوا ہے تو آپ گھبراجائیں گے اور پریشان ہوجائیں گے، لیکن آپ کے چہرہ مبارک پر دور دور تک پریشانی کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے۔ آپ نے اطمینان سے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ بچائیں گے۔ جب اس شخص نے دیکھا کہ آپ کے اوپر پریشانی اور گھبراہٹ کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر ایسا رعب مسلط فرمادیا کہ اس کے ہاتھوں میں لرزہ آگیا اور اس لرزہ کی وجہ سے تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تلوار ہاتھ میں اٹھالی اور فرمایا کہ اب بتاؤ تمہیں کون بچائے گا؟

اس واقعہ کے ذریعہ اس شخص کو یہ دعوت دینی تھی کہ درحقیقت تم اس تلوار پر بھروسہ کررہے تھے اور میں اس تلوار کے پیدا کرنے والے پر بھروسہ کررہا تھا اور

اس تلوار میں تاثیر دینے والے پر بھروسہ کر رہا تھا۔ یہی اسوۂ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سامنے پیش فرمایا، اور اس کے نتیجے میں ایک ایک صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ اسباب بھی اختیار کرتے تھے مگر ساتھ میں بھروسہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کرتے تھے۔

پہلے اسباب پھر توکل

ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جنگل میں اونٹنی لے کر جاتا ہوں اور وہاں نماز کا وقت آجاتا ہے، تو جب نماز کا وقت آجائے اور اس وقت جنگل میں نماز کی نیت باندھنے کا ارادہ کروں تو اس وقت اپنی اونٹنی کا پاؤں کسی درخت کے ساتھ باندھ کر نماز پڑھوں یا اس اونٹنی کو نماز کے وقت کھلا چھوڑ دوں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کروں؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِعْقِلْ ساقھاوتوکّل یعنی اس اونٹنی کی پنڈلی رسّی سے باندھ کر پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔ یعنی آزاد نہ چھوڑو بلکہ اس کو پہلے رسّی سے باندھ دو، لیکن باندھنے کے بعد پھر بھروسہ اس رسّی پر مت کرو بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کرو۔ اس لئے کہ وہ رسّی ٹوٹ بھی سکتی ہے، وہ رسّی دھوکہ بھی دے سکتی ہے۔ اسی حدیث کے مضمون کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مصرعہ کے اندر بیان فرماتے ہیں کہ:

بہ توکل پایۂ اشتر ببند

یعنی توکل پر اونٹنی کا پاؤں باندھو۔ لہٰذا توکل اور اسباب کا اختیار کرنا یہ دونوں چیزیں ایک مؤمن کے ساتھ اس کی زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، پہلے اسباب اختیار کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے کہہ دے اللّٰھم ھذا الجھدو علیک التکلان یا اللہ جو تدبیر اور جو کوشش میرے اختیار میں تھی وہ میں نے اختیار کرلی، اب آگے بھروسہ آپ کی ذات پر ہے۔

اسباب کی یقینی موجودگی کی صورت میں توکل

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک لطیف بات یاد آگئی، وہ فرماتے ہیں کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ توکل صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب ظاہری اسباب کے ذریعہ کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے دونوں کا احتمال موجود ہو، ہوسکتا ہے کہ یہ کام ہوجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کام نہ ہو، اس وقت تو توکل کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہئے۔ لیکن جہاں پر کسی کام کے ہوجانے کی یقینی صورت موجود ہو، وہاں پر اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں، وہ نہ توکل کا موقع ہے اور نہ ہی دعا کا موقع ہے۔

مثلاً ہم دستر خوان پر کھانا کھانے کے لئے بیٹھے ہیں، کھانا سامنے چنا ہوا ہے، بھوک لگی ہوئی ہے، یہ بات بالکل یقینی ہے کہ ہم یہ اٹھا کر کھالیں گے، اب ایسے موقع پر کوئی شخص بھی نہ توکل کرتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ یااللہ! یہ کھانا مجھے کھلادیجئے۔ اور نہ ہی کوئی شخص توکل اور دعا کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

توکل کا اصل موقع یہی ہے

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توکل کا اصل موقع تو یہی ہے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا اصل موقع یہی ہے۔ اس لئے کہ اگر اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے اس ظاہری سبب پر بھروسہ نہیں ہے جو میرے سامنے رکھا ہے، بلکہ مجھے آپ کے رزق دینے پر، آپ کی تخلیق پر، آپ کی قدرت اور رحمت پر بھروسہ ہے۔ اس لئے جب کھانا سامنے دستر خوان پر آجائے تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! یہ کھانا عافیت کے ساتھ

کھلادیجئے۔ کیونکہ اگرچہ غالب گمان یہ ہے کہ کھانا سامنے رکھا ہے، صرف ہاتھ بڑھا کر کھانے کی دیر ہے، لیکن یہ مت بھولو کہ یہ کھانا بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہوگا، کتنے واقعات ایسے پیش آچکے ہیں کہ کھانا دسترخوان پر رکھا تھا، صرف ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی، لیکن کوئی ایسا عارض پیش آگیا یا کوئی ایسی پریشانی کھڑی ہوگئی یا کوئی ایسا حادثہ پیش آگیا کہ آدمی وہ کھانا نہیں کھاسکا، وہ کھانا رکھا کا رکھا رہ گیا۔ لہٰذا اگر کھانا سامنے موجود ہو تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! یہ کھانا مجھے کھلادیجئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ پر تمہیں یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ کام ہوجائے گا، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یااللہ! مجھے تو بظاہر نظر آرہا ہے کہ یہ کام ہوجائے گا، لیکن مجھے پتہ نہیں کہ حقیقت میں یہ کام ہوجائے گا یا نہیں، کیونکہ حقیقت میں تو آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! اس کام کو ٹھیک انجام تک پہنچا دیجئے۔

دونوں صورتوں میں اللہ سے مانگے

جو حدیث میں نے شروع میں بیان کی تھی، اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو لفظ ارشاد فرمائے، وہ یہ کہ تمہیں یا تو اللہ تعالیٰ سے کوئی ضرورت پیش آئے یا کسی آدمی سے کوئی ضرورت پیش آئے۔ یہ دو لفظ اس لئے ارشاد فرمائے کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جس میں کسی آدمی کی مدد یا اس کی مداخلت کا کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کو اولاد کی خواہش ہے، اب ظاہری اسباب میں بھی کسی انسان سے اولاد نہیں مانگی جاسکتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگی جاسکتی ہے۔ بہرحال، وہ خواہش اور ضرورت خواہ ایسی ہو جو براہِ راست اللہ تعالیٰ دینے والے ہیں یا ایسی ضرورت ہو جو آدمی کے واسطے سے اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ جیسے ملازمت اور روزی وغیرہ۔ دونوں صورتوں میں

حقیقت میں تمہارا مانگنا اللہ تعالیٰ سے ہونا چاہئے۔

اطمینان سے وضو کریں

بہرحال، اب اگر تمہارے پاس وقت میں گنجائش ہے اور وہ کام بہت جلدی اور ایمرجنسی کا کام نہیں ہے تو اس کام کے لئے پہلے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھو۔ اور صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا طریقہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے وضو کرو اور اچھی طرح وضو کرو۔ یعنی وہ وضو محض فرض ٹالنے کے انداز میں نہ کرو بلکہ یہ سمجھ کر کرو کہ یہ وضو درحقیقت ایک عظیم الشان عبادت کی تمہید ہے، اس وضو کے کچھ آداب اور کچھ سنّتیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہیں، ان سب کا اہتمام کر کے وضو کرو۔ ہم لوگ دن رات بے خیالی میں جلدی جلدی وضو کر کے فارغ ہوجاتے ہیں، بے شک اس طرح وضو کرنے سے وضو ہو تو جاتا ہے لیکن اس وضو کے انوار و برکات حاصل نہیں ہوتیں۔

وضو سے گناہ دُھل جاتے ہیں

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جس وقت بندہ وضو کرتا ہے اور وضو کے دوران اپنا چہرہ دھوتا ہے تو چہرے سے جتنے گناہ کئے ہیں وہ سب چہرہ کے پانی کے ساتھ دُھل جاتے ہیں، اور جب دایاں ہاتھ دھوتا ہے تو دائیں ہاتھ کے جتنے گناہ ہوتے ہیں وہ سب دُھل جاتے ہیں، اور جب بایاں ہاتھ دھوتا ہے تو بائیں ہاتھ کے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں۔ اس طرح جو جو عضو وہ دھوتا ہے اس عضو کے گناہ صغیرہ معاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب وضو کیا کرو تو ذرا یہ تصور کیا کرو کہ میں اپنا چہرہ دھورہا ہوں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے مطابق میرے چہرے کے گناہ دُھل رہے ہیں، اب ہاتھ دھورہا

ہوں تو ہاتھ کے گناہ دُھل رہے ہیں، اسی تصوّر کے ساتھ مسح کرو اور اسی تصوّر کے ساتھ پاؤں دھوؤ۔ وہ وضو جو اس تصوّر کے ساتھ کیا جائے اور وہ وضو جو اس تصوّر کے بغیر کیا جائے، دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا اور اس وضو کا لطف محسوس ہوگا۔

وضو کے دوران کی دعائیں

بہرحال، ذرا دھیان کے ساتھ وضو کرو اور وضو کے جو آداب اور سنّتیں ہیں، ان کو ٹھیک ٹھیک بجالاؤ۔ مثلاً قبلہ رو ہو کر بیٹھو، اور ہر ہر عضو کو تین تین مرتبہ اطمینان سے دھو، اور وضو کی جو مسنون دعائیں ہیں وہ وضو کے دوران پڑھو۔ مثلاً یہ دعا پڑھو:

﴿اللهم اغفرلی ذنبی و وسع لی فی داری و بارک لی فی ما رزقتنی﴾ (ترمذی، کتاب الدعوات، باب دعاء یقال فی اللیل)

اور کلمہ شہادت پڑھے:

﴿اشهد ان لا اله الا اللّٰه واشهد ان محمدا عبده و رسوله﴾

اور وضو کے بعد یہ دعا پڑھے:

﴿اللهم اجعلنی من التوّابین واجعلنی من المتطهرین﴾ (ترمذی، کتاب الطہارۃ، باب فیما یقال بعد الوضوء)

بس اچھی طرح وضو کرنے کا یہی مطلب ہے۔

’’صلوٰۃ الحاجۃ‘‘ کے لئے خاص طریقہ مقرر نہیں

پھر دو رکعت ’’صلوٰۃ الحاجۃ‘‘ کی نیت سے پڑھو، اور اس صلوٰۃ الحاجۃ کے طریقے

میں کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح عام نماز پڑھی جاتی ہے اسی طرح سے یہ دو رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "صلوٰۃ الحاجۃ" پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے، لوگوں نے اپنی طرف سے اس کے خاص خاص طریقے گھڑ رکھے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے لئے خاص خاص سورتیں بھی متعین کر رکھی ہیں کہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ پڑھے اور دوسری رکعت میں فلاں سورۃ پڑھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "صلوٰۃ الحاجۃ" کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اس میں نماز پڑھنے کا کوئی الگ طریقہ بیان نہیں فرمایا اور نہ کسی سورۃ کی تعیین فرمائی۔

البتہ بعض بزرگوں کے تجربات ہیں کہ اگر "صلوٰۃ الحاجۃ" میں فلاں فلاں سورتیں پڑھ لی جائیں تو بعض اوقات اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، تو اس کو سُنّت سمجھ کر انسان اختیار نہ کرے، اس لئے کہ اگر سُنّت سمجھ کر اختیار کرے گا تو وہ بدعت ہوجائے گا۔ چنانچہ میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنی ہو تو پہلی رکعت میں سورۃ الم نشرح اور دوسری رکعت میں سورۃ "اذا جاء نصراللہ" پڑھ لیا کرو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سورتیں نماز حاجت میں پڑھنا سُنّت ہے بلکہ بزرگوں کے تجربے سے یہ پتہ چلا ہے کہ ان سورتوں کے پڑھنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ لٰہذا اگر کوئی شخص سُنّت سمجھے بغیر ان سورتوں کو پڑھے تو بھی ٹھیک ہے اور اگر ان کے علاوہ کوئی دوسری صورت پڑھ لے تو اس میں سُنّت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی۔ بہرحال، صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے بلکہ جس طرح عام نمازیں پڑھی جاتی ہیں، اسی طرح صلوٰۃ الحاجۃ کی دو رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ بس نماز شروع کرتے وقت دل میں یہ نیت کرلے کہ میں یہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کے طور پر پڑھتا ہوں۔

نماز کے لئے نیت کس طرح کی جائے؟

یہاں پر یہ بھی عرض کردوں کہ آج کل لوگوں میں یہ مشہور ہوگیا ہے کہ ہر نماز کی نیت کے الفاظ علیٰحدہ علیٰحدہ ہوتے ہیں اور جب تک وہ الفاظ نہ کہے جائیں اس وقت تک نماز نہیں ہوتی، اسی وجہ سے لوگ بار بار یہ پوچھتے بھی رہتے ہیں کہ فلاں نماز کی نیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور فلاں نماز کی نیت کس طرح ہوگی؟ اور لوگوں نے نیت کے الفاظ کو باقاعدہ نماز کا حصّہ بنا رکھا ہے۔ مثلاً یہ الفاظ کہ "نیت کرتا ہوں دو رکعت نماز کی، پیچھے اس امام کے، واسطے اللہ تعالیٰ کے، منہ میرا کعبہ شریف کی طرف وغیرہ وغیرہ" خوب سمجھ لیں کہ نیت ان الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ نیت تو دل کے ارادے کا نام ہے، جب آپ نے گھر سے نکلتے وقت دل میں یہ نیت کرلی کہ میں ظہر کی نماز پڑھنے جارہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ میں نماز جنازہ پڑھنے جارہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ میں نماز عید پڑھنے جارہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ میں نماز حاجت پڑھنے جارہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ اب یہ الفاظ زبان سے کہنا نہ تو واجب ہیں نہ ضروری ہیں، نہ سُنّت ہیں، نہ مستحب ہیں، زیادہ سے زیادہ جائز ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا نہ کوئی مخصوص طریقہ ہے اور نہ ہی نیت کے لئے الفاظ مخصوص ہیں، بلکہ عام نمازوں کی طرح دو رکعتیں پڑھ لو۔

دعا سے پہلے اللہ کی حمد و ثناء

پھر جب دو رکعتیں پڑھ لیں تو اب دعا کرو۔ اور یہ دعا کس طرح کرو، اس کے آداب بھی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیئے۔ یہ نہیں کہ بس سلام پھیرتے ہی دعا شروع کردو، بلکہ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرو اور یہ کہو یااللہ! تمام تعریفیں آپ کے لئے ہیں، آپ کا شکر اور احسان ہے۔

حمد و ثناء کی کیا ضرورت ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کیوں کی جائے؟ اور اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی ایک وجہ تو علماء کرامؒ نے یہ بتائی ہے کہ جب آدمی کسی دنیاوی حاکم کے پاس اپنی غرض لے کر جاتا ہے تو پہلے اس کی تعظیم اور تکریم کے لئے کچھ الفاظ زبان سے ادا کرتا ہے تاکہ یہ خوش ہو کر میری مراد پوری کر دے۔ لہٰذا جب دنیا کے ایک معمولی سے حاکم کے سامنے پیش ہوتے وقت اس کے لئے تعریفی کلمات استعمال کرتے ہو تو جب تم احکم الحاکمین کے دربار میں جارہے ہو تو اس کے لئے بھی تعریف کے الفاظ زبان سے کہو کہ یا اللہ! تمام تعریفیں آپ کے لئے ہیں اور آپ کا شکر و احسان ہے، آپ میری یہ ضرورت پوری فرما دیجئے۔

دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنے کی دوسری وجہ بھی ہے اور مجھے ذوقی طور پر اس دوسری وجہ کی طرف زیادہ رجحان ہوتا ہے، وہ وجہ یہ ہے کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی حاجت پیش کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو چونکہ انسان اپنی ضرورت کا غلام ہے اور غرض کا بندہ ہے، اور جب اس کو کسی چیز کی ضرورت اور غرض پیش آتی ہے تو وہ ضرورت اس کے دل و دماغ پر مسلّط ہو جاتی ہے، اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ یااللہ! میری فلاں ضرورت پوری فرما دیجئے۔ اس دعا کے وقت اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس دعا میں ناشکری کا پہلو شامل نہ ہو جائے کہ یا اللہ! آپ میری ضرورت پوری نہیں فرمارہے ہیں، میری حاجتیں آپ پوری نہیں فرمارہے ہیں۔ حالانکہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں بارش کی طرح برس رہی ہیں، دعا کے وقت ان نعمتوں کی طرف انسان کا دھیان نہیں جاتا اور بس اپنی ضرورت اور غرض کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ بہرحال، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی حاجت اور ضرورت لے کر جاؤ تو اس حاجت اور ضرورت کو اللہ تعالیٰ سے ضرور مانگو، لیکن پہلے اس بات کا

استحضار کرلو کہ اس حاجت اور ضرورت کے ابھی تک پورا نہ ہونے کے باوجود تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کی کتنی بے شمار نعمتیں بارش کی طرح برس رہی ہیں۔ پہلے ان کا تو شکر ادا کرلو کہ یا اللہ! یہ نعمتیں جو آپ نے اپنی رحمت سے مجھے دے رکھی ہیں، اس پر آپ کا شکر ہے اور آپ کی حمد ہے، آپ کی ثناء ہے، البتہ ایک حاجت اور ضرورت اور ہے، یا اللہ! اس کو بھی اپنے فضل سے پورا فرمادیجئے۔ تاکہ انسان کی دعا میں ناشکری کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔

غم اور تکالیف بھی نعمت ہیں

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلس میں یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ انسان کو زندگی میں جو غم، صدمے اور تکلیفیں پیش آتی ہیں، اگر انسان غور کرے تو یہ تکلیفیں بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، بیماری بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، فقر و فاقہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اگر انسان کو حقیقت شناس نگاہ مل جائے تو وہ یہ دیکھے کہ یہ سب چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں کس طرح سے نعمت ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آخرت میں اللہ تعالیٰ تکالیف اور مصیبتوں پر صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے، تو جن لوگوں پر دنیا میں زیادہ تکالیف اور مصیبتیں نہیں گزری ہوں گی، وہ تمنا کریں گے کہ کاش! دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں اور پھر ہم اس پر صبر کرتے اور اس صبر پر وہ اجر ملتا جو آج ان صبر کرنے والوں کو مل رہا ہے۔ بہرحال، حقیقت میں یہ دکھ بھی نعمت ہیں، مگر چونکہ ہم کمزور ہیں اس وجہ سے ہمیں ان کے نعمت ہونے کا استحضار نہیں ہوتا۔

حضرت حاجی صاحبؒ کی عجیب دعا

حضرت حاجی صاحبؒ یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ اسی دوران مجلس میں

ایک شخص آگیا جو معذور تھا اور مختلف بیماریوں میں مبتلا تھا، وہ آکر حضرت حاجی صاحبؒ سے کہنے لگا کہ حضرت! میرے لئے دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس تکلیف سے نجات دے دیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جو حاضرین مجلس تھے، حیران ہوگئے کہ ابھی تو حضرت حاجی صاحبؒ فرمارہے تھے کہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں نعمت ہوتی ہیں اور اب یہ شخص تکلیف کے ازالے کی دعا کرارہا ہے، اب اگر حضرت حاجی صاحبؒ اس شخص کے لئے تکلیف کے ازالے کی دعا کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نعمت کے ازالے کی دعا کریں گے؟ حضرت حاجی صاحبؒ نے اسی وقت ہاتھ اٹھا کر یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ! حقیقت میں یہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں نعمت ہیں، لیکن اے اللہ! ہم کمزور ہیں، آپ ہماری کمزوری پر نظر فرماتے ہوئے اس تکلیف کی نعمت کو صحت کی نعمت سے بدل دیجئے۔

تکلیف کے وقت دوسری نعمتوں کا استحضار

اور پھر عین تکلیف کے وقت انسان کو جو بیشمار نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، انسان ان کو بھول جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کے پیٹ میں درد ہورہا ہے، تو اب وہ اس پیٹ کے درد کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، لیکن وہ یہ نہیں دیکھتا کہ آنکھ جو اتنی بڑی نعمت اس کو ملی ہوئی ہے، اس میں کوئی تکلیف نہیں۔ کان کتنی بڑی نعمت ملی ہوئی ہے، اس میں کوئی تکلیف نہیں۔ زبان میں کوئی تکلیف نہیں۔ دانتوں میں کوئی تکلیف نہیں۔ سارے جسم میں اور کسی جگہ تکلیف نہیں، بس صرف پیٹ میں معمولی تکلیف ہورہی ہے۔ اب یہ دعا ضرور کرو کہ یا اللہ! پیٹ کی تکلیف دور کردیجئے، لیکن دعا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اس پر حمد و ثناء کرو کہ یا اللہ! جو اور بیشمار نعمتیں آپ نے عطا کی ہوئی ہیں، اے اللہ! ہم اس پر آپ کا شکر ادا کرتے ہیں، البتہ اس وقت جو یہ تکلیف آگئی ہے اس کے لئے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اس تکلیف کو دور کردیجئے۔

حضرت میاں صاحبؒ اور شکر نعمت

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، یہ مادر زاد ولی اللہ تھے اور عجیب وغریب بزرگ تھے۔ حضرت والد صاحب ان کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ حضرت میاں صاحب بیمار ہیں اور ان کو بخار ہے۔ میں عیادت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ شدید بخار میں تپ رہے ہیں اور بخار کی کرب اور بے چینی کی تکلیف میں ہیں۔ میں نے جاکر سلام کیا اور پوچھا کہ حضرت! کیسے مزاج ہیں؟ طبیعت کیسی ہے؟ جواب میں فرمایا "الحمدللہ میری آنکھیں صحیح کام کررہی ہیں۔ الحمدللہ میرے کان صحیح کام کررہے ہیں، الحمدللہ میری زبان صحیح کام کررہی ہے۔ جتنی تکلیفیں نہیں تھیں ان سب کا ایک ایک کر کے ذکر کیا کہ ان سب میں کوئی بیماری نہیں ہے، البتہ بخار ہے، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرمادے۔ یہ ہے ایک شکر گزار بندے کا عمل جو عین تکلیف میں بھی ان راحتوں اور نعمتوں کا استحضار کررہا ہے جو اس وقت حاصل ہیں، جس کی وجہ سے اس تکلیف کی شدت میں بھی کمی آتی ہے۔

حاصل شدہ نعمتوں پر شکر

بہرحال، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ جو تلقین فرمارہے ہیں کہ دعا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس وقت جو حاجت اور ضرورت پیش کرنے جارہے ہو، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں اس وقت تمہیں حاصل ہیں، پہلے ان کا استحضار کر کے ان پر شکر ادا کرو اور اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرو۔

حمد و ثناء کے بعد درود شریف کیوں؟

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد کیا کرے؟ اس کے لئے ارشاد فرمایا کہ ولیصل علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم حمد و ثناء کے بعد اور اپنی حاجت پیش کرنے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس وقت درود بھیجنے کا کیا موقع ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت پر بہت ہی زیادہ شفیق اور مہربان ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب میرا اُمتی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا مانگے تو اس کی وہ دعا رد نہ ہو۔ پوری کائنات میں درود شریف کے علاوہ کسی دعا کے بارے میں یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ ضرور قبول ہوگی، لیکن اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا جائے تو اس کے بارے میں یہ گارنٹی یقینی ہے کہ وہ ضرور قبول ہوگا۔ جب ہم درود بھیجتے ہیں۔ اللّٰھم صلی علی محمد وعلی آل محمد النبی الامّی اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمتیں نازل فرمایئے۔ یہ ایسی دعا ہے کہ اس کے رد ہونے کا کوئی امکان نہیں، اس کی قبولیت کا وعدہ ہے، اس کی قبولیت کی گارنٹی ہے کہ یہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر تو پہلے سے رحمتیں نازل ہو رہی ہیں اور مزید نازل ہوتی رہیں گی، وہ ہمارے درود بھیجنے کے محتاج نہیں ہیں۔

درود شریف بھی قبول اور دعا بھی قبول

لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے ہیں کہ میرے اُمتی اپنی مراد اور ضرورت مانگنے سے پہلے مجھ پر درود بھیج دیں تو اللہ تعالیٰ اس درود کو ضرور قبول فرمائیں گے، اور جب درود شریف کو قبول فرمائیں گے تو اس حاجت اور ضرورت کی دعا کو بھی ضرور قبول فرمائیں گے، اس لئے کہ ان کی رحمت سے یہ بات بعید ہے کہ ایک دعا کو تو قبول فرمالیں اور دوسری دعا کو رد فرمادیں۔ اس لئے درود شریف کے

بعد کی جانے والی دعا کی قبولیت کی زیادہ امید ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ہدیہ کا بدلہ

ایک دوسری وجہ میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عمر بھر کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ لے کر آتا تو آپ اس ہدیہ کا کچھ نہ کچھ بدلہ ضرور دیا کرتے تھے اور ہدیہ کی مکافات فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ درود شریف بھی ایک ہدیہ ہے، اس لئے کہ حدیث شریف میں صراحت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص دور سے درود شریف بھیجتا ہے تو وہ درود مجھ تک پہنچایا جاتا ہے، اور جو شخص قبر پر آکر مجھ کو سلام کرے اور درود بھیجے تو میں خود اس کو سنتا ہوں۔ یہ درود شریف ایک اُمتی کا تحفہ اور ہدیہ ہے جو آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ لہٰذا جب دنیا میں اور زندگی میں آپ کی سُنّت یہ تھی کہ جب آپ کے پاس کوئی شخص ہدیہ لے کر آتا تو آپ اس کی مکافات فرمایا کرتے تھے اور اس ہدیہ کے بدلے ہدیہ دیا کرتے تھے، تو امید یہ ہے کہ عالم برزخ میں جب ایک اُمتی کی طرف سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درود شریف کا یہ ہدیہ پہنچے گا تو آپ اس ہدیہ کا بھی بدلہ عطا فرمائیں گے، وہ بدلہ یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمتی کے حق میں دعائیں کریں گے کہ یااللہ! اس اُمتی نے میرے لئے یہ تحفہ بھیجا ہے اور میرے لئے دعا کی ہے، اے اللہ! میں اس کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اس کی مراد پوری فرمادیں۔ لہٰذا جو اُمتی درود بھیجنے کے بعد دعا کرے گا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے وہاں دعا فرمائیں گے۔ اس لئے جب دعا کرنے بیٹھو تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرو اور پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو۔

دعاء حاجت کے الفاظ

اس کے بعد دعا کے یہ الفاظ کہو "لا الٰہ الا اللّٰہ الحلیم الکریم" اللہ تعالیٰ

کے اسماء حسنیٰ کے اندر کیا کیا انورات اور کیا کیا خواص پوشیدہ ہیں یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں، ہم لوگ اس کی تہہ تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ان اسماء حسنیٰ میں اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود خاصیتیں رکھی ہیں اس لئے جب خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ تلقین فرمائیں کہ ان اسماء حسنیٰ کا ذکر کرو تو اس کے پیچھے ضرور کوئی راز ہوتا ہے۔ لہٰذا خاص طور پر وہی کلمات کہنے چاہئیں تاکہ وہ مقصد حاصل ہو۔ چنانچہ فرمایا لا الٰہ الا اللّٰہ الحلیم الکریم اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اللہ جو حلیم ہیں اور کریم ہیں۔ "حلم" بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور "کرم" بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ ان دونوں صفتوں کو خاص طور پر بظاہر اس لئے ذکر فرمایا کہ بندہ پہلے مرحلے پر ہی یہ اعتراف کرے کہ یا اللہ! میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ آپ میری دعا قبول کریں، اپنی ذات کے لحاظ سے میں اس لائق نہیں ہوں کہ آپ کی بارگاہ میں کوئی درخواست پیش کرسکوں، اس وجہ سے کہ میرے گناہ بے شمار ہیں، میری خطائیں بے شمار ہیں، میری بداعمالیاں اتنی ہیں کہ آپ کے حضور درخواست پیش کرنے کی لیاقت مجھ میں نہیں ہے، لیکن چونکہ آپ حلیم ہیں، بردباری آپ کی صفت ہے، اور اس کی وجہ سے کوئی بندہ چاہے وہ کتنا ہی خطاکار ہو، اس خطاکار کی خطاؤں کی وجہ سے جذبات میں آکر آپ کوئی فیصلہ نہیں فرماتے، بلکہ اپنی صفت "حلم" کے تحت فیصلہ فرماتے ہیں، اس لئے میں صفت "حلم" کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں، اور آپ کی صفت "حلم" کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ میرے گناہوں سے درگزر فرمائیں۔ اور پھر صفت "کرم" کا معاملہ فرمائیں یعنی صرف یہ نہ ہو کہ گناہوں سے درگزر فرمائیں بلکہ اوپر سے مزید نوازشیں عطا فرمائیں، مزید اپنا کرم میرے اوپر فرمائیں۔ صفت کرم اور صفت حلم کا واسطہ دے کر دعا کرو۔

اس کے بعد فرمایا سبحان اللّٰہ رب العرش العظیم اللہ تعالیٰ پاک ہے جو عرش عظیم کا مالک ہے۔ والحمدللّٰہ رب العٰلمین اور تمام تعریفیں اس اللہ کے

لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ پہلے یہ تعریفی کلمات کہے اور اس کے بعد ان الفاظ کے ساتھ دعا کرے۔ اللّٰھم انی اسألک موجبات رحمتک اے اللہ میں آپ سے ان چیزوں کا سوال کرتا ہوں جو آپ کی رحمت کا موجب ہوں۔ وعزائم مغفرتک اور آپ کی پختہ مغفرت کا سوال کرتا ہوں۔ والغنیمة من کل بر اور اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ مجھے ہر نیکی سے حصّہ عطا فرمایئے۔ والسلامة من کل اثم اور مجھے ہر گناہ سے محفوظ رکھئے۔ لاتدع لنا ذنبًا الا غفرته ہمارا کوئی گناہ ایسا نہ چھوڑیئے جس کو آپ نے معاف نہ فرمایا ہو۔ یعنی ہر گناہ کو معاف فرمادیجئے ولاھمًّا الا فرجته اور کوئی تکلیف ایسی نہ چھوڑیئے جس کو آپ نے دور نہ فرمادیا ہو۔ ولا حاجة ھی لک رضی الا قضیتھا یا ارحم الراحمین اور کوئی حاجت جس میں آپ کی رضامندی ہو ایسی نہ چھوڑیئے کہ اس کو آپ نے پورا نہ فرمایا ہو۔ یہ دعا کے الفاظ اور اس کا ترجمہ ہے اور مسنون دعاؤں کی کتابوں میں بھی یہ دعا موجود ہے، یہ دعا ہر مسلمان کو یاد کرلینی چاہئے۔ اس کے بعد پھر اپنے الفاظ میں جو حاجت مانگنا چاہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ اس دعا کو ضرور قبول فرمائیں گے۔

ہر ضرورت کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھیں

ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سُنّت بیان کی گئی ہے کہ: ﴿کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اذا حزبه امر صلی﴾

(ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب وقت قیام النبی ؐ من اللیل)

یعنی جب کبھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تشویش کا معاملہ پیش آتا تو آپ سب سے پہلے نماز کی طرف دوڑتے اور یہی صلوٰۃ الحاجۃ پڑھتے اور دعا کرتے کہ یا اللہ! یہ مشکل پیش آگئی ہے، آپ اس کو دور فرمادیجئے۔ اس لئے ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ کی کثرت کرے۔

اگر وقت تنگ ہو تو صرف دعا کرے

یہ تفصیل تو اس صورت میں ہے جب انسان کے پاس فیصلہ کرنے کے لئے وقت ہے اور دو رکعت پڑھنے کی گنجائش ہے، لیکن اگر جلدی کا موقع ہے اور اتنی مہلت نہیں ہے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر دعا کرے، تو اس صورت میں دو رکعت پڑھے بغیر ہی دعا کے یہ الفاظ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ لیکن اپنی ہر حاجت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ضرور پیش کردے، چاہے وہ چھوٹی حاجت ہو یا بڑی حاجت ہو۔ حتیٰ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ لہٰذا جب چھوٹی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا حکم دیا جارہا ہے تو بڑی چیز اور زیادہ اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہئے۔ اور درحقیقت یہ چھوٹی اور بڑی ہماری نسبت سے ہے، جوتے کے تسمہ کا درست ہوجانا یہ چھوٹی بات ہے اور سلطنت کا ملجانا بڑی بات ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں چھوٹے بڑے کا کوئی فرق نہیں، ان کے نزدیک سب کام چھوٹے ہیں، ہماری بڑی سے بڑی حاجت، بڑے سے بڑا مقصد اللہ تعالیٰ کے نزدیک چھوٹا ہے۔ ان اللّٰہ علٰی کل شئی قدیر اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ ان کی قدرت ہر چیز پر یکساں ہے، اس کے لئے کوئی کام مشکل نہیں، اس کے لئے کوئی کام بڑا نہیں۔ اس لئے بڑی حاجت ہو یا چھوٹی حاجت ہو، بس اللہ ہی سے مانگو۔

یہ پریشانیاں اور ہمارا حال

آج کل ہمارے شہر میں ہر شخص پریشان ہے، ہمارے شہر کی کیا حالت بنی ہوئی ہے۔ العیاذ باللہ۔ کوئی گھرانہ ایسا نہیں ہے جو ان حالات کی وجہ سے بے چینی اور بے تابی کا شکار نہ ہو، کوئی براہ راست مبتلا ہے اور کوئی بالواسطہ مبتلا ہے، کوئی اندیشوں کا شکار ہے، کسی کی جان مال عزت آبرو محفوظ نہیں، سب کا بُرا حال ہے۔ لیکن دوسری طرف ہمارا حال یہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک اس صورت حال پر

تبصرے تو بہت کرتے ہیں، جہاں چار آدمی بیٹھے اور تبصرے شروع ہوگئے، فلاں جگہ یہ ہوگیا، فلاں جگہ یہ ہوگیا، فلاں نے یہ غلطی کی، فلاں نے یہ غلطی کی، حکومت نے یہ غلطی کی وغیرہ۔ لیکن ہم میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو تڑپ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کی توفیق ہوئی، کہ یا اللہ! یہ مصیبت ہم پر مسلط ہے، ہمارے گناہوں کا وبال ہم پر مسلط ہے، ہماری شامت اعمال ہم پر مسلط ہے، یا اللہ! اپنی رحمت سے اس کو دور فرمادیں۔ بتائیے کہ ہم میں سے کتنوں کو اس کی توفیق ہوئی؟

تبصرہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں

۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان کے سقوط کا واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں کی تاریخ میں ذلت کا ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا جو اس موقع پر پیش آیا کہ نوے ہزار مسلمانوں کی فوج ہندوؤں کے آگے ہتھیار ڈال کر ذلیل ہوگئی۔ تمام مسلمانوں پر اس کے صدمے کا اثر تھا، سب لوگ پریشان تھے۔ اسی دوران میری حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کے یہاں حاضری ہوئی، میرے ساتھ میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم بھی تھے، جب وہاں پہنچے تو کچھ خاص خاص لوگ وہاں موجود تھے، اب وہاں پر تبصرے شروع ہوگئے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ کون اس کا سبب بنا؟ کس کی غلطی ہے؟ کسی نے کہا کہ فلاں پارٹی کی غلطی ہے، کسی نے کہا کہ فلاں پارٹی کی غلطی ہے، کسی نے کہا کہ فوج کی غلطی ہے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ تھوڑی دیر تک سب کی باتیں سنتے رہے، اس کے بعد حضرت والا فرمانے لگے کہ اچھا بھائی! آپ لوگوں نے کوئی فیصلہ کرلیا کہ کون مجرم ہے؟ اور کون بے گناہ ہے؟ اور اس فیصلے کے نتائج کیا نکلے؟ جو مجرم ہے کیا اس کو سزا دوگے؟ اور جو بے گناہ ہے اس کی برأت کا اظہار کردوگے؟ یہ بتاؤ کہ اتنی دیر تک تم جو تبصرے کرتے رہے اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ کیا دنیا یا آخرت کا کوئی فائدہ تمہیں حاصل ہوا؟

تبصرہ کے بجائے دعا کریں

اگر اتنی دیر تم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کے لئے ہاتھ اٹھادیتے اور اللہ تعالیٰ سے کہتے کہ یا اللہ! ہماری شامت اعمال کے نتیجے میں ہم پر یہ مصیبت آگئی ہے، اے اللہ! ہمیں معاف فرما اور ہم سے اس مصیبت کو دور فرما اور ہماری شامت اعمال کو رفع فرما اور اس ذلّت کو عزت سے بدل دیجئے۔ اگر یہ دعا کرلی ہوتی تو کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول فرمالیتے اور اگر بالفرض وہ دعا قبول نہ ہوتی تب بھی اس دعا کے کرنے کا ثواب تو حاصل ہوجاتا اور آخرت کی نعمت تمہیں حاصل ہوجاتی۔ اب یہ تم نے بیٹھ کر جو فضول تبصرے کئے اس سے نہ کوئی دنیا کا فائدہ ہوا اور نہ ہی آخرت کا کوئی فائدہ ہوا۔

اس وقت ہماری آنکھیں کھلیں کہ واقعۃً ہم دن رات اس مرض میں مبتلا ہیں کہ دن رات بس ان باتوں پر تبصرے ہورہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوکر مانگنے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ہم میں کتنے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ان حالات سے بیتاب ہوکر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں کیں اور صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر دعا کی ہو، کہ یا اللہ! میں صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ رہا ہوں، اے اللہ! اپنی رحمت سے یہ عذاب ہم سے دور فرمادیجئے۔ یہ کام شاذ و نادر ہی کسی اللہ کے بندے نے کیا ہوگا، لیکن صبح سے لے کر شام تک تبصرے ہورہے ہیں، وقت ان تبصروں میں صرف ہورہا ہے، اور پھر ان تبصروں میں معلوم نہیں کتنی غیبت ہورہی ہے، کتنے بہتان باندھے جارہے ہیں، اور ان کے ذریعہ الٹا اپنے سر گناہ لے رہے ہیں۔

اللہ کی طرف رجوع کریں

تمام حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ان حالات میں دعا کی طرف توجہ کریں۔ اگر کسی کے بس میں کوئی تدبیر ہے تو وہ تدبیر اختیار کرے اور اگر تدبیر اختیار میں

نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا تو ہر ایک کے اختیار میں ہے۔ ہمارے اندر سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا سلسلہ اب ختم ہوتا جارہا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب پاکستان بن رہا تھا، اس وقت ملک میں فسادات ہورہے تھے، اس وقت دیوبند اور دوسرے شہروں میں گھر گھر آیت کریمہ کا ختم ہورہا تھا، کسی کی طرف سے اپیل نہیں تھی، بلکہ مسلمان اپنی تحریک سے اور اپنے شوق سے اور ضرورت محسوس کر کے گھر گھر اور محلہ محلہ آیت کریمہ کا ختم کررہے تھے، عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھی ہوئی آیت کریمہ کا ختم کررہی تھیں اور دعائیں ہورہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس مصیبت سے نکال دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس مصیبت سے نجات دیدی۔

پھر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں

آج ہمارے شہر میں سب کچھ ہورہا ہے، آنکھوں کے سامنے لاشیں تڑپ رہی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ کیا آپ نے کہیں سنا کہ محلوں میں یا گھروں میں آیت کریمہ کا ختم کیا جارہا ہو اور دعا کرنے کا اہتمام ہورہا ہو۔ بلکہ یہ ہورہا ہے کہ آنکھوں کے سامنے لاشیں تڑپ رہی ہیں، موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے، اور لوگ گھروں میں بیٹھ کر وی سی آر دیکھ رہے ہیں۔ اب بتایئے ان حالات میں اللہ تعالیٰ کا قہر اور عذاب نازل نہ ہو تو کیا ہو۔ تمہارے سامنے اچھا خاصا آدمی ذرا سی دیر میں دنیا سے چل بسا، لیکن پھر بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں پھر بھی تم گناہوں کو نہیں چھوڑتے، پھر بھی اللہ کی نافرمانی پر کمر باندھے ہوئے ہو۔

اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے یہ کام کرلو

خدا کے لئے اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا

سلسلہ شروع کردو۔ اور کون مسلمان ایسا ہے جو یہ نہیں کرسکتا کہ وہ اس مقصد کے لئے دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کی نیت سے پڑھ لیا کرے۔ دو رکعتیں پڑھنے میں کتنی دیر لگتی ہے اوسطاً دو رکعت پڑھنے میں دو منٹ لگتے ہیں، اور دو رکعت کے بعد دعا کرنے میں تین منٹ مزید لگ جائیں گے۔ اپنی اس قوم اور اس ملّت کے لئے پانچ منٹ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوکر دعا مانگنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی تو پھر کس منہ سے کہتے ہو کہ ہمیں قوم میں ہونے والے ان فسادات کی وجہ سے صدمہ اور رنج اور تکلیف ہورہی ہے۔ لہٰذا جب تک ان فسادات کا سلسلہ جاری ہے، اس وقت تک روزانہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ اور خدا کے لئے اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نافرمانی کے ذرائع اور آلے کو نکال دو اور نافرمانی اور گناہ کے سلسلے کو بند کردو، اور اللہ تعالیٰ کے حضور رو رو کر اور گڑگڑا کر دعا کرو۔ آیت کریمہ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین کا ختم کرو اور "یا سلام" کا ورد کرو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ فضول تبصروں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کام میں لگو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العٰلمین

رمضان کس طرح گزاریں؟

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی
وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب
اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رمضان کس طرح گزاریں؟

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئاتِ أعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضلّ لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد أن لا الٰہ إلا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہٗ ونشھدأن سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ وأصحابہ وبارک وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیراً۔

اما بعد!

فأعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

شَھۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡھُدٰی وَالۡفُرۡقَانِ، فَمَنۡ شَھِدَ مِنۡکُمُ الشَّھۡرَ فَلۡیَصُمۡہُ۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۸۵)

اٰمنت باللّٰہ صدق اللّٰہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذلک من الشاھدین والشاکرین، والحمدللّٰہ رب العٰلمین۔

رمضان، ایک عظیم نعمت

بزرگان محترم و برادران عزیز! یہ رمضان المبارک کا مہینہ اللہ جل شانہ کی بڑی عظیم نعمت ہے۔ ہم اور آپ اس ۔رک مہینے کی حقیقت اور اس کی قدر کیسے جان

سکتے ہیں، کیونکہ ہم لوگ دن رات اپنے دنیاوی کاروبار میں الجھے ہوئے ہیں اور صبح سے شام تک دنیا ہی کی دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے ہیں اور مادیت کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم کیا جانیں کہ رمضان کیا چیز ہے؟ اللہ جلّ شانہ جن کو اپنے فضل سے نوازتے ہیں اور اس مبارک مہینے میں اللہ جلّ شانہ کی طرف سے انوار و برکات کا جو سیلاب آتا ہے اس کو پہچانتے ہیں، ایسے حضرات کو اس مہینے کی قدر ہوتی ہے۔ آپ نے یہ حدیث سنی ہوگی کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رجب کا چاند دیکھتے تو دعا فرمایا کرتے تھے کہ:

﴿اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ رَجَبَ وَ شَعْبَانَ وَ بَلِّغْنَا رَمَضَانَ﴾

(مجمع الزوائد جلد ۲ صفحہ ۱۶۵)

اے اللہ، ہمارے لئے رجب اور شعبان کے مہینوں میں برکت عطا فرما اور ہمیں رمضان کے مہینے تک پہنچادیجئے۔ یعنی ہماری عمر اتنی دراز کر دیجئے کہ ہمیں اپنی عمر میں رمضان کا مہینہ نصیب ہوجائے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ رمضان آنے سے دو ماہ پہلے رمضان کا انتظار اور اشتیاق شروع ہوگیا اور اس کے حاصل ہوجانے کی دعا کررہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ مہینہ نصیب فرمادے۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جس کو رمضان المبارک کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو۔

عمر میں اضافے کی دعا

اس حدیث سے یہ پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص اس نیت سے اپنی عمر میں اضافے کی دعا کرے کہ میری عمر میں اضافہ ہوجائے تاکہ اس عمر کو میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق صحیح استعمال کرسکوں اور پھر وہ آخرت میں کام آئے، تو عمر کے اضافے کی یہ دعا کرنا اس حدیث سے ثابت ہے۔ لہٰذا یہ دعا مانگنی چاہئے کہ یا اللہ! میری عمر میں اتنا اضافہ فرمادیں کہ میں اس میں آپ کی رضا کے مطابق کام کرسکوں اور جس وقت

میں آپ کی بارگاہ میں پہنچوں تو اس وقت آپ کی رضا کا مستوجب بن جاؤں۔ لیکن جو لوگ اس قسم کی دعا مانگتے ہیں کہ "یا اللہ! اب تو اس دنیا سے اٹھا ہی لے" حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی دعا کرنے سے منع فرمایا ہے اور موت کی تمنا کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ ارے تم تو یہ سوچ کر موت کی دعا کررہے ہو کہ یہاں (دنیا میں) حالات خراب ہیں جب وہاں چلے جائیں گے تو وہاں اللہ میاں کے پاس سکون مل جائے گا۔ ارے یہ تو جائزہ لو کہ تم نے وہاں کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ کیا معلوم کہ اگر اس وقت موت آجائے تو خدا جانے کیا حالات پیش آئیں۔ اس لئے ہمیشہ یہ دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ عافیت عطا فرمائے اور جب تک اللہ تعالیٰ نے عمر مقرر کر رکھی ہے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

زندگی کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کی دعا

چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

﴿اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیَاۃُ خَیْراً لِیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْراً لِیْ﴾ (مسند احمد جلد ۳ صفحہ ۱۰۴)

اے اللہ! جب تک میرے حق میں زندگی فائدہ مند ہے، اس وقت تک مجھے زندگی عطا فرما، اور جب میرے حق میں موت فائدہ مند ہوجائے، اے اللہ! مجھے موت عطا فرما۔ لہٰذا یہ دعا کرنا کہ یا اللہ! میری عمر میں اتنا اضافہ کردیجئے کہ آپ کی رضا کے مطابق اس میں کام کرنے کی توفیق ہوجائے، یہ دعا کرنا درست ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی اس دعا سے مستفاد ہوتی ہے کہ اے اللہ! ہمیں رمضان تک پہنچادیجئے۔

رمضان کا انتظار کیوں؟

اب سوال یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اشتیاق اور انتظار کیوں ہورہا ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ آجائے اور ہمیں مل جائے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کو اپنا مہینہ بنایا ہے، ہم لوگ چونکہ ظاہر بین قسم کے لوگ ہیں، اس لئے ظاہری طور پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ رمضان المبارک کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ روزوں کا مہینہ ہے، اس میں روزے رکھے جائیں گے اور تراویح پڑھی جائیگی اور بس۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بات یہاں تک ختم نہیں ہوتی، بلکہ روزے ہوں یا تراویح ہوں یا رمضان المبارک کی کوئی اور عبادت ہو، یہ سب عبادات ایک اور بڑی چیز کی علامت ہیں، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کو اپنا مہینہ بنایا ہے تاکہ وہ لوگ جو گیارہ مہینے تک مال کی دوڑ دھوپ میں لگے رہے اور ہم سے دور رہے اور اپنے دنیوی کاروبار میں الجھے رہے اور خواب غفلت میں مبتلا رہے، ہم ان لوگوں کو ایک مہینہ اپنے قرب کا عطا فرماتے ہیں، ان سے کہتے ہیں کہ تم ہم سے بہت دور چلے گئے تھے اور دنیا کے کام دھندوں میں الجھ گئے تھے، تمہاری سوچ، تمہاری فکر، تمہارا خیال، تمہارے اعمال، تمہارے افعال، یہ سب دنیا کے کاموں میں لگے ہوئے تھے، اب ہم تمہیں ایک مہینہ عطا کرتے ہیں، اس مہینے میں تم ہمارے پاس آجاؤ اور اس کو ٹھیک گزار لو، تو تمہیں ہمارا قرب حاصل ہوجائے گا، کیونکہ یہ ہمارے قرب کا مہینہ ہے۔

انسان کی پیدائش کا مقصد

دیکھئے! انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے اندر ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاریات: ۵۶)

یعنی میں نے جنات اور انسان کو صرف ایک کام کے لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ انسان کا اصل مقصدِ زندگی اور اس کے دنیا میں آنے اور دنیا میں رہنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ جلّ شانہ کی عبادت کرے۔

کیا فرشتے عبادت کے لئے کافی نہیں تھے؟

اب اگر کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اس مقصد کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پہلے ہی پیدا فرما دیا تھا، اب اس مقصد کے لئے دوسری مخلوق یعنی انسان کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتے اگرچہ عبادت کے لئے پیدا کئے گئے تھے، لیکن وہ اس طرح پیدا کئے گئے تھے کہ خلقتاً عبادت کرنے پر مجبور تھے، اس لئے کہ ان کی فطرت میں صرف عبادت کا مادہ رکھا گیا تھا، عبادت کے علاوہ گناہ اور معصیت اور نافرمانی کا مادہ رکھا ہی نہیں گیا تھا۔ لیکن حضرتِ انسان اس طرح پیدا کئے گئے کہ ان کے اندر نافرمانی کا مادہ بھی رکھا گیا، گناہ کا مادہ بھی رکھا گیا، اور پھر حکم دیا گیا کہ عبادت کرو۔ اس لئے فرشتوں کے لئے عبادت کرنا آسان تھا لیکن انسان کے اندر خواہشات ہیں، جذبات ہیں، محرکات ہیں، اور ضروریات ہیں، اور گناہوں کے دواعی ہیں، اور پھر حکم یہ دیا گیا کہ گناہوں کے ان دواعی سے بچتے ہوئے اور ان جذبات کو کنٹرول کرتے ہوئے اور گناہوں کی خواہشات کو کچلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔

عبادات کی دو قسمیں

یہاں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے، جس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات گمراہیاں پیدا ہو جاتی ہیں، وہ یہ کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ مؤمن کا ہر کام عبادت ہے، یعنی اگر مؤمن کی نیت صحیح ہے اور اس کا طریقہ صحیح ہے اور وہ سُنّت کے مطابق زندگی گزار رہا ہے تو پھر اس کا کھانا بھی عبادت ہے، اس کا سونا بھی

عبادت ہے، اس کا ملنا جلنا بھی عبادت ہے، اس کا کاروبار کرنا بھی عبادت ہے، اس کا بیوی بچوں کے ساتھ ہنسا بولنا بھی عبادت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح ایک مؤمن کے یہ سب کام عبادت ہیں، اسی طرح نماز بھی عبادت ہے، تو پھر ان دونوں عبادتوں میں کیا فرق ہے؟ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے اور اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ گمراہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

پہلی قسم: براہِ راست عبادت

ان دونوں عبادتوں میں فرق یہ ہے کہ ایک قسم کے اعمال وہ ہیں جو براہِ راست عبادت ہیں، اور جن کا مقصد اللہ تعالیٰ کی بندگی کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے اور وہ اعمال صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لئے ہی وضع کئے گئے ہیں۔ جیسے نماز ہے، اس نماز کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے کہ بندہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اللہ تعالیٰ کے آگے سرِ نیاز جھکائے، اس نماز کا کوئی اور مقصد اور مصرف نہیں ہے، لہٰذا یہ نماز اصلی عبادت اور براہِ راست عبادت ہے۔ اسی طرح روزہ، زکوٰۃ، ذکر، تلاوت، صدقات، حج، عمرہ، یہ سب اعمال ایسے ہیں کہ ان کو صرف عبادت ہی کے لئے وضع کیا گیا ہے، ان کا کوئی اور مقصد اور مصرف نہیں ہے، یہ براہِ راست عبادتیں ہیں۔

دوسری قسم: بالواسطہ عبادت

ان کے مقابلے میں کچھ اعمال وہ ہیں جن کا اصل مقصد تو کچھ اور تھا، مثلاً اپنی دنیاوی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مؤمن سے یہ کہہ دیا کہ اگر تم اپنے دنیاوی کاموں کو بھی نیک نیتی سے، ہماری مقرر کردہ حدود کے اندر اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے مطابق انجام دوگے تو ہم تمہیں ان کاموں پر بھی ویسا ہی ثواب دیں گے جیسے ہم پہلی قسم کی

عبادات پر دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ عبادات براہِ راست نہیں ہیں بلکہ بالواسطہ عبادت ہیں اور یہ عباذات کی دوسری قسم ہے۔

"حلال کمانا" بالواسطہ عبادت ہے

مثلاً یہ کہہ دیا کہ اگر تم بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کے لئے جائز حدود کے اندر رہ کر کماؤ گے اور اس نیت کے ساتھ رزقِ حلال کماؤ گے کہ میرے ذمے میری بیوی کے حقوق ہیں، میرے ذمے میرے بچوں کے حقوق ہیں، میرے ذمے میرے نفس کے حقوق ہیں، ان حقوق کو ادا کرنے کے لئے میں کما رہا ہوں، تو اس کمائی کرنے کو بھی اللہ تعالیٰ عبادت بنادیتے ہیں۔ لیکن اصلاً یہ کمائی کرنا عبادت کے لئے نہیں بنایا گیا، اس لئے یہ کمائی کرنا براہِ راست عبادت نہیں بلکہ بالواسطہ عبادت ہے۔

براہِ راست عبادت افضل ہے

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو عبادت براہِ راست عبادت ہے، وہ ظاہر ہے کہ اس عبادت سے افضل ہوگی جو بالواسطہ عبادت ہے اور اس کا درجہ زیادہ ہوگا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ "میں نے جنات اور انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا تاکہ وہ میری عبادت کریں" اس سے مراد عبادت کی پہلی قسم ہے جو براہِ راست عبادت ہیں۔ عبادت کی دوسری قسم مراد نہیں جو بالواسطہ عبادت ہیں۔

ایک ڈاکٹر صاحب کا واقعہ

چند روز پہلے ایک خاتون نے مجھ سے پوچھا کہ میرے شوہر ڈاکٹر ہیں، انہوں نے اپنا کلینک کھول رکھا ہے، مریضوں کو دیکھتے ہیں، اور جب نماز کا وقت آتا ہے تو وہ

وقت پر نماز نہیں پڑھتے، اور رات کو جب کلینک بند کر کے گھر واپس آتے ہیں تو تینوں نمازیں ایک ساتھ پڑھ لیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ گھر آکر ساری نمازیں اکٹھی کیوں پڑھتے ہیں، وہیں کلینک میں وقت پر نماز ادا کرلیا کریں تاکہ قضا نہ ہوں۔ جواب میں شوہر نے کہا کہ میں مریضوں کا جو علاج کرتا ہوں، یہ خدمتِ خلق کا کام ہے اور خدمتِ خلق بہت بڑی عبادت ہے اور اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اس لئے میں اس کو ترجیح دیتا ہوں، اور نماز پڑھنا چونکہ میرا ذاتی معاملہ ہے، اس لئے میں گھر آکر اکٹھی ساری نمازیں پڑھ لیتا ہوں۔ تو وہ خاتون مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میں اپنے شوہر کی اس دلیل کا کیا جواب دوں؟

نماز کسی حال معاف نہیں

حقیقت میں ان کے شوہر کو یہاں سے غلط فہمی پیدا ہوئی کہ ان دونوں قسم کی عبادتوں کے مرتبے میں جو فرق ہے اس فرق کو نہیں سمجھے۔ وہ فرق یہ ہے کہ نماز کی عبادت براہِ راست ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم جنگ کے میدان میں بھی ہو اور دشمن سامنے موجود ہو تب بھی نماز پڑھو، اگرچہ اس وقت نماز کے طریقے میں آسانی پیدا فرمادی، لیکن نماز کی فرضیت اس وقت بھی ساقط نہیں فرمائی۔ چنانچہ نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾

(النساء:١٠٣)

"بیشک نماز اپنے مقررہ وقت پر مؤمنین پر فرض ہے"۔

اب بتایئے کہ جہاد سے بڑھ کر اور کیا عمل ہوگا، لیکن حکم یہ دیا کہ جہاد میں بھی وقت پر نماز پڑھو۔

خدمتِ خلق دوسرے درجے کی عبادت ہے

حتیٰ کہ اگر ایک انسان بیمار پڑا ہوا ہے اور اتنا بیمار ہے کہ وہ کوئی کام انجام نہیں دے سکتا، اس حالت میں بھی یہ حکم ہے کہ نماز مت چھوڑو، نماز تو ضرور پڑھو، لیکن ہم تمہارے لئے یہ آسانی کردیتے ہیں کہ کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھ لو، بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھ لو اور اشارہ سے پڑھ لو، وضو نہیں کرسکتے تو تیمم کرلو، لیکن پڑھو ضرور۔ یہ نماز کسی حال میں بھی معاف نہیں فرمائی، اس لئے کہ نماز براہِ راست اور مقصود بالذّات عبادت ہے اور پہلے درجے کی عبادت ہے، اور ڈاکٹر صاحب جو مریضوں کا علاج کرتے ہیں یہ خدمتِ خلق ہے، یہ بھی بہت بڑی عبادت ہے، لیکن یہ دوسرے درجے کی عبادت ہے، براہِ راست عبادت نہیں۔ لہٰذا اگر ان دونوں قسموں کی عبادتوں میں تعارض اور تقابل ہوجائے تو اس صورت میں اس عبادت کو ترجیح ہوگی جو براہِ راست عبادت ہے۔ چونکہ ان ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں قسم کی عبادتوں کے درمیان فرق کو نہیں سمجھا، اس کے نتیجے میں اس غلطی کے اندر مبتلا ہوگئے۔

دوسری ضروریات کے مقابلے میں نماز زیادہ اہم ہے

دیکھئے! جس وقت آپ مطب میں خدمتِ خلق کے لئے بیٹھتے ہیں، اس دوران آپ کو دوسری ضروریات کے لئے بھی تو اٹھنا پڑتا ہے، مثلاً اگر بیت الخلاء جانے کی یا غسل خانے میں جانے کی ضرورت پیش آجائے تو آخر اس وقت بھی تو آپ مریضوں کو چھوڑ کر جائیں گے، اسی طرح اگر اس وقت بھوک لگی ہوئی ہے اور کھانے کا وقت آگیا ہے، اس وقت آپ کھانے کے لئے وقفہ کریں گے یا نہیں؟ جب آپ ان کاموں کے لئے اٹھ کر جاسکتے ہیں، تو اگر نماز کا وقت آنے پر نماز کے لئے اٹھ جائیں گے تو اس وقت کیا دشواری پیش آجائے گی؟ اور خدمتِ خلق میں کون سی

رکاوٹ پیدا ہوجائیگی؟ جب کہ دوسری ضروریات کے مقابلہ میں نماز زیادہ اہم ہے۔ دراصل دونوں عبادتوں میں فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ یوں تو دوسری قسم کی عبادت کے لحاظ سے ایک مؤمن کا ہر کام عبادت بن سکتا ہے، اگر ایک مؤمن نیک نیتی سے سُنّت کے طریقے پر کام کرے تو اس کی ساری زندگی عبادت ہے، لیکن وہ دوسرے درجے کی عبادت ہے۔ پہلے درجے کی عبادت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اللہ کا ذکر وغیرہ، یہ براہِ راست اللہ کی عبادتیں ہیں اور اصل میں انسان کو اسی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

انسان کا امتحان لینا ہے

انسان کو اس عبادت کے لئے اس لئے پیدا فرمایا تاکہ یہ دیکھیں کہ یہ انسان جس کے اندر ہم نے مختلف قسم کے داعیے اور خواہشات رکھی ہیں، ہم نے اس کے اندر گناہوں کے جذبات اور ان کا شوق رکھا ہے، ان تمام چیزوں کے باوجود یہ انسان ہماری طرف آتا ہے اور ہمیں یاد کرتا ہے یا یہ گناہوں کے داعیے کی طرف جاتا ہے اور ان جذبات کو اپنے اوپر غالب کرلیتا ہے۔ اس مقصد کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا۔

یہ حکم بھی ظلم نہ ہوتا

جب یہ بات سامنے آگئی کہ انسان کا مقصودِ زندگی عبادت ہے، لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو یہ حکم دیتے کہ چونکہ تم دنیا کے اندر عبادت کے لئے آئے ہو اور تمہاری زندگی کا مقصد بھی عبادت ہے، تو اب صبح سے شام تک تمہارا اور کوئی کام نہیں، بس ایک ہی کام ہے، اور وہ یہ کہ تم ہمارے سامنے ہر وقت سجدے میں پڑے رہو اور ہمارا ذکر کرتے رہو، اور جہاں تک ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے تو چلو ہم تمہیں اتنی مہلت دیتے ہیں کہ درمیان میں اتنا وقفہ کرنے کی اجازت ہے کہ تم

درمیان میں دوپہر کا کھانا اور شام کا کھانا کھالیا کرو تاکہ تم زندہ رہ سکو، لیکن باقی سارا وقت ہمارے سامنے سجدہ میں رہتے ہوئے گزار دو۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ حکم جاری کردیتے تو کیا ہم پر کوئی ظلم ہوتا؟ ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ ہمیں پیدا ہی اسی کام کے لئے کیا گیا ہے۔

ہم اور آپ بکے ہوئے مال ہیں

لہٰذا ایک طرف تو عبادت کے مقصد سے پیدا فرمایا، اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ (التوبۃ:۱۱۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری جانیں اور تمہارا مال خرید لیا ہے اور اس کی قیمت جنّت لگادی ہے۔ لہٰذا ہم اور آپ تو بکے ہوئے مال ہیں، ہماری جان بھی بکی ہوئی ہے اور ہمارا مال بھی بکا ہوا ہے۔ اب اگر ان کو خریدنے والا جس نے ان کی اتنی بڑی قیمت لگائی ہے یعنی جنّت، جس کی چوڑائی آسمان و زمین کے برابر ہے، وہ خریدار اگر یہ کہہ دے کہ تمہیں صرف اپنی جان بچانے کی حد تک کھانے پینے کی اجازت ہے اور کسی کام کی اجازت نہیں ہے، بس ہمارے سامنے سجدے میں پڑے رہو، تو اسے یہ حکم دینے کا حق تھا، ہم پر کوئی ظلم نہ ہوتا، لیکن یہ عجیب خریدار ہے جس نے ہماری جان اور مال کو خرید لیا اور اس کی اتنی بڑی قیمت بھی لگادی اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ہم نے تمہاری جان بھی خریدلی اور اب تمہیں ہی واپس کردیتے ہیں، تم ہی اپنی جان سے فائدہ اٹھاؤ اور ساری زندگی اس سے کام لیتے رہو۔ کھاؤ، کماؤ، تجارت کرو، ملازمت کرو اور دنیا کی دوسری جائز خواہشات پوری کرو، سب کی تمہیں اجازت ہے، بس اتنی بات ہے کہ پانچ وقت ہمارے دربار میں آجایا کرو، اور تھوڑی

سی پابندی لگاتے ہیں کہ یہ کام اس طرح کرو اور اس طرح نہ کرو۔ بس ان کاموں کی پابندی کرلو، باقی تمہیں کھلی چھوٹ ہے۔

انسان اپنا مقصدِ زندگی بھول گیا

اب جب اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو اس کی جان اور اس کا مال واپس دے دیا اور یہ کہہ دیا کہ تمہارے لئے تجارت بھی جائز، ملازمت بھی جائز، زراعت بھی جائز۔ جب سب چیزیں جائز کردیں تو اب اس کے بعد جب یہ حضرت انسان تجارت کرنے کے لئے اور ملازمت کرنے کے لئے، زراعت کرنے اور کھانے کمانے کے لئے نکلے تو وہ یہ بھول گئے کہ ہم اس دنیا میں کیوں بھیجے گئے تھے؟ اور ہمارا مقصدِ زندگی کیا تھا؟ کس نے ہمیں خریدا تھا؟ اور اس خریداری کا کیا مقصد تھا؟ اس نے ہم پر کیا پابندیاں لگائی تھیں؟ اور کیا احکام ہمیں دیئے تھے؟ یہ سب باتیں تو بھول گئے، اور اب خوب تجارت ہورہی ہے، خوب پیسہ کمایا جارہا ہے، اور آگے بڑھنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے اور اسی کی فکر ہے اور اسی میں دن رات لگا ہوا ہے۔ اور اگر کسی کو نماز کی فکر ہوئی بھی تو حواس باختہ حالت میں مسجد میں حاضر ہوگیا، اب دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے اور جلدی جلدی جیسی تیسی نماز ادا کی اور پھر واپس جاکر تجارت میں لگ گیا۔ اور کبھی مسجد میں بھی آنے کی توفیق نہیں ہوئی تو گھر میں پڑھ لی، اور کبھی نماز ہی نہ پڑھی اور قضا کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دنیاوی اور تجارتی سرگرمیاں انسان پر غالب آتی چلی گئیں۔

عبادت کی خاصیت

عبادت کا خاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کا رشتہ جوڑتی ہے، اس کے ساتھ ایک تعلق قائم کرتی ہے، جس کے نتیجے میں انسان کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

دنیاوی کاموں کی خاصیت

دوسری طرف دنیاوی کاموں کی خاصیت یہ ہے کہ اگرچہ انسان ان کو صحیح دائرے میں رہ کر بھی کرے، مگر پھر بھی یہ دنیاوی کام رفتہ رفتہ انسان کو معصیت کی طرف لے جاتے ہیں اور روحانیت سے دور کردیتے ہیں۔
اب جب گیارہ مہینے اسی دنیاوی کاموں میں گزر گئے اور اس میں مادّیت کا غلبہ رہا اور روپے پیسے حاصل کرنے اور زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کا غلبہ رہا تو اس کے نتیجے میں انسان پر مادّیت غالب آگئی اور عبادتوں کے ذریعہ جو رشتہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ قائم ہونا تھا، وہ رشتہ کمزور ہوگیا، اس کے اندر ضعف آگیا، اور جو قرب حاصل ہونا تھا وہ حاصل نہ ہوسکا۔

رحمت کا خاص مہینہ

تو چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ جو انسان کے خالق ہیں، وہ جانتے تھے کہ یہ حضرت انسان جب دنیا کے کام دھندے میں لگے گا تو ہمیں بھول جائے گا، اور پھر ہماری عبادات کی طرف اس کا اتنا انہماک نہیں ہوگا جتنا دنیاوی کاموں کے اندر اس کو انہماک ہوگا، تو اللہ تعالیٰ نے اس انسان سے فرمایا کہ ہم تمہیں ایک موقع اور دیتے ہیں اور ہر سال تمہیں ایک مہینہ دیتے ہیں، تاکہ جب تمہارے گیارہ مہینے ان دنیاوی کام دھندوں میں گزر جائیں اور مادّے کے اور روپے پیسے کے چکر میں الجھے ہوئے گزر جائیں تو اب ہم تمہیں رحمت کا ایک خاص مہینہ عطا کرتے ہیں، اس ایک مہینہ کے اندر تم ہمارے پاس آجاؤ تاکہ گیارہ مہینوں کے دوران تمہاری روحانیت میں جو کمی واقع ہوگئی ہے اور ہمارے ساتھ تعلق اور قرب میں جو کمی واقع ہوگئی ہے، اس مبارک مہینہ میں تم اس کمی کو دور کرلو۔ اور اس مقصد کے لئے بھی ہم تمہیں یہ ہدایت کا مہینہ عطا کرتے ہیں کہ تمہارے دلوں پر جو زنگ لگ گیا ہے اس کو دور

کرلو، اور ہم سے جو دور چلے گئے ہو اب قریب آجاؤ، اور جو غفلت تمہارے اندر پیدا ہوگئی ہے اس کو دور کر کے اپنے دلوں کو ذکر سے آباد کرلو۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے رمضان کا مہینہ عطا فرمایا۔ ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا قرب پیدا کرنے کے لئے روزہ اہم ترین عنصر ہے، روزہ کے علاوہ اور جو عبادات اس ماہ مبارک میں مشروع کی گئی ہیں وہ بھی سب اللہ تعالیٰ کے قرب کے لئے اہم عناصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ دور بھاگے ہوئے انسان کو اس مہینے کے ذریعہ اپنا قرب عطا فرمادیں۔

اب قرب حاصل کرلو

چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ﴾ (البقرة : ۱۸۳)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ گیارہ مہینوں تک تم جن کاموں میں مبتلا رہے ہو، ان کاموں نے تمہارے تقویٰ کی خاصیت کو کمزور کردیا، اب روزے کے ذریعہ اس تقویٰ کی خاصیت کو دوبارہ طاقت ور بنالو۔ لہٰذا بات صرف اس حد تک ختم نہیں ہوتی کہ روزہ رکھ لیا اور تراویح پڑھ لی، بلکہ پورے رمضان کو اس کام کے لئے خاص کرنا ہے کہ گیارہ مہینے ہم لوگ اپنی اصل مقصدِ زندگی سے اور عبادت سے دور چلے گئے تھے، اس دوری کو ختم کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ رمضان کے مہینے کو پہلے ہی سے زیادہ سے زیادہ عبادات کے لئے فارغ کیا جائے، اس لئے کہ دوسرے کام دھندے تو گیارہ مہینے تک چلتے رہیں گے، لیکن اس مہینے کے اندر ان کاموں کو جتنا مختصر سے

مختصر کرسکتے ہو کرلو، اور اس مہینے کو خالص عبادات کے کاموں میں صرف کرلو۔

رمضان کا استقبال

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ رمضان کا استقبال اور اس کی تیاری یہ ہے کہ انسان پہلے سے یہ سوچے کہ میں اپنے روزمرہ کے کاموں میں سے مثلاً تجارت، ملازمت، زراعت وغیرہ کے کاموں میں سے کن کن کاموں کو مؤخر کرسکتا ہوں، ان کو مؤخر کردے، اور پھر ان کاموں سے جو وقت فارغ ہو اس کو عبادت میں صرف کرے۔

رمضان میں سالانہ چھٹیاں کیوں؟

ہمارے دینی مدارس میں عرصۂ دراز سے یہ رواج اور طریقہ چلا آرہا ہے کہ سالانہ چھٹیاں اور تعطیلات ہمیشہ رمضان المبارک کے مہینے میں کی جاتی ہیں۔ ۱۵ شعبان کو تعلیمی سال ختم ہوجاتا ہے اور ۱۵ شعبان سے لے کر ۱۵ شوال تک دو ماہ کی سالانہ چھٹیاں ہوجاتی ہیں۔ شوال سے نیا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کا جاری کیا ہوا طریقہ ہے۔ اس طریقہ پر لوگ اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ مولوی صاحبان رمضان میں لوگوں کو اس بات کا سبق دیتے ہیں کہ آدمی رمضان کے مہینے میں بیکار ہو کر بیٹھ جائے، حالانکہ صحابۂ کرام نے تو رمضان المبارک میں جہاد کیا اور دوسرے کام کئے۔ خوب سمجھ لیں کہ اگر جہاد کا موقع آجائے تو بیشک آدمی جہاد بھی کرے، چنانچہ غزوہ بدر اور فتح مکہ رمضان المبارک میں ہوئے۔ لیکن جب سال کے کسی مہینے میں چھٹی کرنی ہی ہے تو اس کے لئے رمضان کے مہینے کا انتخاب اس لئے کیا تاکہ اس مہینے کو زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی براہِ راست عبادت کے لئے فارغ کرسکیں۔

اگرچہ ان دینی مدارس میں پورے سال جو کام ہوتے ہیں وہ بھی سب کے سب

عبادت ہیں، مثلاً قرآنِ کریم کی تعلیم، حدیث کی تعلیم، فقہ کی تعلیم وغیرہ، مگر یہ سب بالواسطہ عبادات ہیں۔ لیکن رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس مہینے کو میری براہِ راست عبادات کے لئے فارغ کرلو۔ اس لئے ہمارے بزرگوں نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ جب چھٹی کرنی ہی ہے تو بجائے گرمیوں میں چھٹی کرنے کے رمضان میں چھٹی کرو تاکہ رمضان کا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی براہِ راست عبادات میں صرف کیا جاسکے۔ لہٰذا رمضان المبارک میں چھٹی کرنے کا اصل منشا یہ ہے۔

بہرحال، رمضان المبارک میں چھٹی کرنا جن کے اختیار میں ہو وہ حضرات تو چھٹی کرلیں اور جن حضرات کے اختیار میں نہ ہو وہ کم از کم اپنے اوقات کو اس طرح مرتّب کریں کہ اس کا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی براہِ راست عبادت میں گزرجائے۔ اور حقیقت میں رمضان کا مقصود بھی یہی ہے۔

حضور ﷺ کو عباداتِ مقصودہ کا حکم

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ دیکھو قرآنِ کریم کی سورۃ الم نشرح میں اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝﴾

(سورۃ الم نشرح)

یعنی جب آپ (دوسرے کاموں سے جن میں آپ مشغول ہیں) فارغ ہوجائیں تو (اللہ تعالیٰ کی عبادت میں) تھکئے۔ کس کام کے کرنے میں تھکئے؟ نماز پڑھنے میں، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے میں، اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرنے میں تھکئے، اور اپنے رب کی طرف رغبت کا اظہار کیجئے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے

تھے کہ تم ذرا سوچو تو سہی کہ یہ خطاب کس ذات سے ہورہا ہے؟ یہ خطاب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہورہا ہے، اور آپ سے یہ کہا جارہا ہے کہ جب آپ فارغ ہوجائیں، یہ تو دیکھو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کن کاموں میں لگے ہوئے تھے جن سے فراغت کے بعد تھکنے کا حکم دیا جارہا ہے؟ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دنیاوی کاموں میں لگے ہوئے تھے؟ نہیں، بلکہ آپ کا تو ایک ایک کام عبادت ہی تھا، یا تو آپ کا کام تعلیم دینا تھا یا تبلیغ کرنا تھا یا جہاد کرنا تھا یا تربیت اور تزکیہ تھا، تو آپ کا تو اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود آپ سے کہا جارہا ہے کہ جب آپ ان کاموں سے فارغ ہوجائیں یعنی تعلیم کے کام سے اور تبلیغ کے کام سے اور جہاد کے کام سے فارغ ہوجائیں تو اب آپ ہمارے سامنے کھڑے ہو کر تھکئے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری ساری رات نماز کے اندر اس طرح کھڑے ہوتے کہ آپ کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کاموں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مشغول تھے وہ بالواسطہ عبادت تھی اور جس عبادت کی طرف اس آیت میں آپ کو بلایا جارہا تھا وہ براہِ راست عبادت تھی۔

مولوی کا شیطان بھی مولوی

ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے، یعنی شیطان مولویوں کو علمی انداز سے دھوکے دیتا ہے۔ چنانچہ مولوی کا شیطان مولوی صاحب سے کہتا ہے کہ یہ جو کہا جارہا ہے کہ تم گیارہ مہینے تک دنیاوی کاموں میں لگے رہے، یہ ان لوگوں سے کہا جارہا ہے جو تجارت اور کاروبار میں لگے رہے اور معیشت کے کاموں میں اور دنیاوی دھندوں میں اور ملازمتوں میں لگے رہے، لیکن تم تو گیارہ مہینے تک دین کی خدمت میں لگے رہے، تم تو تعلیم دیتے رہے، تبلیغ کرتے رہے، وعظ کرتے رہے، تصنیف اور فتویٰ کے کاموں میں لگے رہے اور

یہ سب دین کے کام ہیں۔ حقیقت میں یہ شیطان کا دھوکا ہوتا ہے، اس لئے کہ گیارہ مہینے تک تم جن عبادات میں مشغول تھے وہ عبادت بالواسطہ تھی اور اب رمضان المبارک براہِ راست عبادت کا مہینہ ہے، یعنی وہ عبادت کرنی ہے جو براہِ راست عبادت کے کام ہیں۔ اس عبادت کے لئے یہ مہینہ آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مہینہ کو اس عبادت میں استعمال کرنے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین

چالیس مقاماتِ قُرب حاصل کرلیں

اب آپ اپنا ایک نظام الاوقات اور ٹائم ٹیبل بنائیں کہ کس طرح یہ مہینہ گزارنا ہے، چنانچہ جتنے کاموں کو مؤخر کرسکتے ہیں ان کو مؤخر کردو۔ اور روزہ تو رکھنا ہی ہے اور تراویح بھی انشاء اللہ ادا کرنی ہی ہے، ان تراویح کے بارے میں حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ بڑے مزے کی بات فرمایا کرتے تھے کہ یہ تراویح بڑی عجیب چیز ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو روزانہ عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ مقاماتِ قُرب عطا فرمائے ہیں، اس لئے کہ تراویح کی بیس رکعتیں ہیں جن میں چالیس سجدے کئے جاتے ہیں اور ہر سجدہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا اعلیٰ ترین مقام ہے کہ اس سے زیادہ اعلیٰ مقام کوئی اور نہیں ہوسکتا، جب انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتا ہے اور اپنی معزز پیشانی زمین پر ٹیکتا ہے اور زبان پر "سبحان ربی الاعلیٰ" کے الفاظ ہوتے ہیں تو یہ قُربِ خداوندی کا وہ اعلیٰ ترین مقام ہوتا ہے جو کسی اور صورت میں نصیب نہیں ہوسکتا۔

ایک مؤمن کی معراج

یہی مقامِ قُرب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے موقع پر لائے تھے، جب معراج کے موقع پر آپ کو اتنا اونچا مقام بخشا گیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ میں اپنی اُمت کے لئے کیا تحفہ لے کر جاؤں، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا

کہ اُمت کے لئے یہ "سجدے" لے جاؤ، ان میں سے ہر سجدہ مؤمن کی معراج ہے۔ فرمایا الصلوۃ معراج المؤمنین یعنی جس وقت کوئی مؤمن بندہ اپنی پیشانی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زمین پر رکھ دے گا تو اس کو معراج حاصل ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ سجدہ مقامِ قُرب ہے۔

سجدہ میں قُربِ خداوندی

سورۃ اقرأ میں اللہ تعالیٰ نے کتنا پیارا جملہ ارشاد فرمایا۔ یہ آیت سجدہ ہے، لہٰذا تمام حضرات سجدہ بھی کرلیں۔ فرمایا کہ:

﴿ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۞ ﴾ (سورۃ علق: ۱۹)

سجدہ کرو اور ہمارے پاس آجاؤ۔ معلوم ہوا کہ ہر سجدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قُرب کا ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے، اور رمضان کے مہینے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں چالیس سجدے اور عطا فرمادیئے، جس کا مطلب یہ ہے کہ چالیس مقاماتِ قُرب ہر بندے کو روزانہ عطا کئے جارہے ہیں۔ یہ اس لئے دیے کہ گیارہ مہینے تک تم جن کاموں میں لگے رہے، ان کاموں کی وجہ سے ہمارے اور تمہارے درمیان کچھ دوری پیدا ہوگئی ہے، اس دوری کو ختم کرنے کے لئے روزانہ چالیس مقاماتِ قُرب دے کر ہم تمہیں قریب کررہے ہیں، اور وہ ہے "تراویح" لہٰذا اس تراویح کو معمولی مت سمجھو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو آٹھ رکعت تراویح پڑھیں گے، بیس نہیں پڑھیں گے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرمارہے ہیں کہ ہم تمہیں چالیس مقاماتِ قُرب عطا فرماتے ہیں، لیکن یہ حضرات کہتے ہیں کہ نہیں صاحب، ہمیں تو صرف سولہ ہی کافی ہیں، چالیس کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے ان مقاماتِ قُرب کی قدر نہیں پہچانی، تبھی تو ایسی باتیں کررہے ہیں۔

تلاوتِ قرآنِ کریم کی کثرت کریں

بہرحال، روزہ تو رکھنا ہی ہے اور تراویح تو پڑھنی ہی ہے، اس کے علاوہ بھی جتنا وقت ہوسکے عبادات میں صرف کرو۔ مثلاً تلاوت قرآنِ کریم کا خاص اہتمام کرو، کیونکہ اس رمضان کے مہینے کو قرآنِ کریم سے خاص مناسبت ہے، اس لئے اس میں زیادہ سے زیادہ تلاوت کرو۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رمضان المبارک میں روزانہ ایک قرآنِ کریم دن میں ختم کیا کرتے تھے اور ایک قرآنِ کریم رات میں ختم کیا کرتے تھے اور ایک قرآنِ کریم تراویح میں ختم فرماتے تھے، اس طرح پورے رمضان میں اکسٹھ قرآنِ کریم ختم کیا کرتے تھے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ رمضان کے دن اور رات میں ایک قرآنِ کریم ختم کیا کرتے تھے۔ بڑے بڑے بزرگوں کے معمولات میں تلاوت قرآنِ کریم داخل رہی ہے۔ لہٰذا ہم بھی رمضان المبارک میں عام دنوں کی مقدار کے مقابلے میں تلاوت کی مقدار کو زیادہ کریں۔

نوافل کی کثرت کریں

دوسرے ایام میں جن نوافل کو پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی، ان کو رمضان المبارک میں پڑھنے کی کوشش کریں۔ مثلاً تہجد کی نماز پڑھنے کی عام دنوں میں توفیق نہیں ہوتی، لیکن رمضان المبارک میں رات کے آخری حصے میں سحری کھانے کے لئے تو اٹھنا ہوتا ہی ہے، تھوڑی دیر پہلے اٹھ جائیں اور اسی وقت تہجد کی نماز پڑھ لیں۔ اس کے علاوہ اشراق کی نوافل، چاشت کی نوافل، اوابین کی نوافل، عام ایام میں اگر نہیں پڑھی جاتیں تو کم از کم رمضان المبارک میں تو پڑھ لیں۔

صدقات کی کثرت کریں

رمضان المبارک میں زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقات بھی زیادہ سے زیادہ دینے کی

کوشش کریں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا دریا ویسے تو سارے سال ہی موجزن رہتا تھا، لیکن رمضان المبارک میں آپ کی سخاوت ایسی ہوتی تھی جیسے جھونکیں مارتی ہوئی ہوائیں چلتی ہیں، جو آپ کے پاس آیا اس کو نواز دیا۔ لہٰذا ہم بھی رمضان المبارک میں صدقات کی کثرت کریں۔

ذکر اللہ کی کثرت کریں

اس کے علاوہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کریں۔ ہاتھوں سے کام کرتے رہیں اور زبان پر اللہ تعالیٰ کا ذکر جاری رہے۔ **سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر۔ سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم۔ لاحول ولاقوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم۔** ان کے علاوہ درود شریف اور استغفار کی کثرت کریں، اور ان کے علاوہ جو ذکر بھی زبان پر آجائے بس چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہیں۔

گناہوں سے بچنے کا اہتمام کریں

اور رمضان المبارک میں خاص طور پر گناہوں سے اجتناب کریں اور اس سے بچنے کی فکر کریں۔ یہ طے کرلیں کہ رمضان کے مہینے میں یہ آنکھ غلط جگہ پر نہیں اٹھے گی۔ انشاء اللہ۔ یہ طے کرلیں کہ رمضان المبارک میں اس زبان سے غلط بات نہیں نکلے گی۔ انشاء اللہ۔ جھوٹ، غیبت، یا کسی کی دل آزاری کا کوئی کلمہ نہیں نکلے گا۔ رمضان المبارک کے مہینے میں اس زبان پر تالا ڈال لو، یہ کیا بات ہوئی کہ روزہ رکھ کر حلال چیزوں کے کھانے سے تو پرہیز کرلیا، لیکن رمضان میں مردہ بھائی کا گوشت کھارہے ہو۔ اس لئے کہ غیبت کرنے کو قرآنِ کریم نے مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے برابر قرار دیا ہے۔ لہٰذا غیبت سے بچنے کا اہتمام کریں۔ جھوٹ

سے بچنے کا اہتمام کریں۔ اور فضول کاموں سے، فضول مجلسوں سے اور فضول باتوں سے بچنے کا اہتمام کریں۔ اس طرح یہ رمضان کا مہینہ گزارا جائے۔

دعا کی کثرت کریں

اس کے علاوہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی خوب کثرت کریں۔ رحمت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، رحمت کی گھٹائیں جھوم جھوم کر برس رہی ہیں، مغفرت کے بہانے ڈھونڈے جارہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز دی جارہی ہے کہ ہے کوئی مجھ سے مانگنے والا جس کی دعا میں قبول کروں۔ لہٰذا صبح کا وقت ہو یا شام کا وقت ہو یا رات کا وقت ہو، ہر وقت مانگو۔ وہ تو یہ فرمارہے ہیں کہ افطار کے وقت مانگ لو، ہم قبول کرلیں گے۔ رات کو مانگ لو، ہم قبول کرلیں گے۔ روزہ کی حالت میں مانگ لو، ہم قبول کرلیں گے۔ آخر رات میں مانگ لو، ہم قبول کرلیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا ہے کہ ہر وقت تمہاری دعائیں قبول کرنے کیلئے دروازے کھلے ہوئے ہیں، اس لئے خوب مانگو۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ مانگنے کا مہینہ ہے، اس لئے ان کا معمول یہ تھا کہ رمضان المبارک میں عصر کی نماز کے بعد مغرب تک مسجد ہی میں بیٹھ جاتے تھے اور اس وقت کچھ تلاوت کرلی، کچھ تسبیحات اور مناجات مقبول پڑھ لی، اور اس کے بعد باقی سارا وقت افطار تک دعا میں گزارتے تھے، اور خوب دعائیں کیا کرتے تھے۔ اس لئے جتنا ہوسکے اللہ تعالیٰ سے خوب دعائیں کرنے کا اہتمام کرو۔ اپنے لئے، اپنے اعزہ اور احباب کیلئے، اپنے متعلقین کے لئے، اپنے ملک و ملت کیلئے، عالم اسلام کیلئے دعائیں مانگو۔ اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس رمضان کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے اوقات کو صحیح طور پر خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

دوستی اور دشمنی میں اعتدال

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دوستی اور دشمنی میں اعتدال

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینه ونستغفرہ و نؤمن به ونتوکّل علیه، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیٔات اعمالنا، من یهدہ اللّٰہ فلا مضلّ له ومن یضلله فلا هادی له، ونشهد ان لا اله الا اللّٰہ وحدہ لاشریک له، ونشهدان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسوله، صلی اللّٰہ تعالٰی علیه وعلٰی اٰله واصحابه وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا۔

امابعد!

﴿عن ابی هریرة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: احبب حبیبک هونا ماعسٰی ان یکون بغیضک یوماما۔ وابغض بغیضک هونا ماعسٰی ان یکون حبیبک یوماما﴾

(ترمذی شریف، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی الاقتصاد فی الحب والبغض حدیث نمبر ۱۹۹۸)

دوستی کرنے کا زرّین اصول

یہ حدیث حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے اور سند کے اعتبار سے صحیح حدیث ہے۔ یہ بڑی عجیب حدیث ہے اور اس میں بڑا عجیب سبق دیا ہے اور اس میں ہماری پوری زندگی کے لئے زرّین اصول بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے دوست سے دھیرے دھیرے محبت کرو۔ یعنی اعتدال سے کرو، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا وہ دوست کسی دن تمہارا دشمن بن جائے اور مبغوض بن جائے۔ اور جس شخص سے تمہیں دشمنی اور بغض ہے، اس کے ساتھ بغض اور دشمنی بھی دھیرے دھیرے کرو، کیا پتہ کہ وہ دشمن کسی دن تمہارا محبوب اور دوست بن جائے۔

اس حدیث میں یہ عجیب تعلیم ارشاد فرمائی کہ دوست سے دوستی اور اور محبت بھی اعتدال کے ساتھ کرو اور جس سے دشمنی ہو تو اس کے ساتھ دشمنی بھی اعتدال کے ساتھ ہو۔ یاد رکھو، دنیا کی دوستیاں اور محبتیں بھی پائیدار نہیں ہوتیں اور دنیا کی دشمنیاں اور بغض بھی پائیدار نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ دوستی دشمنی میں تبدیل ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے۔ اس لئے اعتدال سے آگے نہ بڑھو۔

ہماری دوستی کا حال

اس حدیث میں ان لوگوں کو خاص طور پر زرّین تعلیم عطا فرمائی جن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب ان کی دوستی کسی سے ہو جاتی ہے یا کسی سے تعلّق ہو جاتا ہے اور محبت ہو جاتی ہے تو اس دوستی اور محبت میں بے دھڑک آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں کہ پھر ان کو کسی حد کی پرواہ نہیں ہوتی، بس جن سے محبت اور تعلّق قائم ہو گیا اب ان کے اندر کوئی عیب نظر نہیں آتا اور اب دن رات کھانا پینا ان کے ساتھ ہے، اٹھنا بیٹھنا ان کے ساتھ ہے، چلنا پھرنا ان کے ساتھ ہے، ہر کام ان کے ساتھ ہے، اور دن رات ان کی رفاقت اور صحبت حاصل ہے اور ان کی تعریف کے گن گائے جا رہے ہیں۔ لیکن اچانک معلوم ہوا کہ دوستی ٹوٹ گئی، اب وہ دوستی ایسی ٹوٹی کہ اب ایک دوسرے کی شکل و صورت دیکھنے کے روادار نہیں، ایک دوسرے کا نام

سننے کے روادار نہیں، اب ان کے اندر ایک اچھائی بھی نظر نہیں آتی بلکہ اب ان کی بُرائیاں شروع ہوگئیں۔ یہ انتہا پسندی اور یہ اعتدال سے باہر جانا شریعت کا تقاضہ نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، بلکہ یہ تعلیم دی ہے کہ محبت بھی اعتدال سے کرو اور اگر بغض ہے تو وہ بھی اعتدال سے رکھو، کسی بھی چیز کو حد سے آگے نہ بڑھاؤ۔

دوستی کے لائق ایک ذات

یاد رکھو، اول تو دوستی اور محبت جس چیز کا نام ہے، یہ دنیا کی مخلوق میں حقیقی اور صحیح معنی میں تو ہے ہی نہیں، اصل دوستی اور محبت کے لائق تو صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ اللہ جلّ جلالہ کی ذات ہے۔ دل میں بٹھانے کے لائق کہ جس کی محبت دل میں گھس جائے وہ تو ایک ہی ذات ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جو دل بنایا ہے وہ صرف اپنے لئے ہی بنایا ہے، یہ انہی کی تجلّی گاہ ہے اور انہی کے لئے بنا ہے۔ اب اس دل میں کسی اور کو اس طرح بٹھانا کہ وہ دل پر قبضہ جمالے، یہ کسی مؤمن کے لئے مناسب نہیں، کیونکہ دوستی کے لائق تو ایک ہی ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ ایک سچّے دوست

اگر اس کائنات میں کوئی شخص کسی کا سچا دوست ہوسکتا تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوستی کا تعلّق جس طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبھایا اس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔ کوئی دوسرا شخص یہ دعویٰ ہی نہیں کرسکتا کہ میں ان جیسی دوستی کرسکتا ہوں، ہر ہر مرحلے پر آپ کو آزمایا گیا مگر آپ کھرے نکلے۔ پہلے دن سے جب آپ حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم پر آمنّا و صدّقنا کہہ کر ایمان لائے تھے، ساری عمر اس تصدیق اور ایمان میں ذرہ برابر کبھی تزلزل نہیں آیا۔

غارِ ثور کا واقعہ

غارِ ثور میں آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، جس کو قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا اذھما فی الغار اذیقول لصاحبہ لاتحزن ان اللّٰہ معنا یعنی وہ دونوں غار میں تھے تو وہ اپنے ساتھی سے فرمارہے تھے کہ آپ غم نہ کریں، بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں۔ جب غار کے اندر داخل ہونے لگے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے داخل ہوئے تاکہ غار کو صاف فرمائیں اور غار کے اندر سانپ بچھو اور زہریلے جانوروں کے جو بل ہیں ان کو بند فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے کپڑے کاٹ کر ان سوراخوں کو بند فرمایا اور جب کپڑے ختم ہو گئے اور سوراخ باقی رہ گئے تو آپ نے اپنے پاؤں کی ایڑی سے سوراخوں کو بند فرمایا۔

ہجرت کا ایک واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے سفر میں تھے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کے چہرہ انور پر بھوک کے آثار دیکھے، آپ کہیں سے دودھ لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لاکر پیش کیا، حالانکہ اس وقت آپ خود بھی بھوک سے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پی لیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعد میں اس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح دودھ پیا کہ میں سیراب ہوگیا۔ یعنی دودھ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیا لیکن سیراب میں ہوگیا۔ لہٰذا دوستی اور ایثار و قربانی کا جو مقام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیش کیا وہ دنیا میں کوئی دوسرا

شخص پیش نہیں کرسکتا۔

دوستی اللہ کے ساتھ خاص ہے

لیکن اس کے باوجود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

﴿لوكنت متخذا خليلا لاتخذت ابابكر خليلا﴾

(بخاری شریف، کتاب الفضائل، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لوکنت متخذا خلیلا)

یعنی اگر میں اس دنیا میں کسی کو سچا دوست بناتا تو "ابوبکر" کو بناتا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو بھی دوست بنایا نہیں، اس لئے کہ اس دنیا میں حقیقی معنیٰ کا دوست بننے کے لائق کوئی نہیں ہے، یہ دوستی تو صرف اللہ جلّ شانہٗ کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ ایسی دوستی جو انسان کے دل پر قبضہ جمالے کہ جو وہ کہے وہ کرے اور پھر انسان کا دل اس کے تابع ہوجائے، یہ دوستی اللہ کے سوا کسی اور کے ساتھ زیبا نہیں۔

دوستی اللہ کی دوستی کے تابع ہونی چاہئے

البتہ دنیا کے اندر جو دوستی ہوگی وہ اللہ کی محبت اور دوستی کے تابع ہوگی۔ چنانچہ دوست کے کہنے کی وجہ سے گناہ نہیں کیا جائے گا، دوستی کی مد میں معصیت اور نافرمانی نہیں ہوگی۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دنیا میں تمام دوستیاں اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے تابع ہونی چاہئیں۔

مخلص دوستوں کا فقدان

دوسری بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ایسا دوست ملتا ہی کہاں ہے جس کی دوستی

اللہ کی دوستی کے تابع ہو، تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کے باوجود بھی ایسا دوست نہیں ملتا جس کو صحیح معنیٰ میں دوست کہہ سکیں اور جس کی دوستی اللہ کی دوستی کے تابع ہو اور جو کڑی آزمائش کے وقت پکّا نکلے۔ ایسا دوست بڑی مشکل سے ملتا ہے، قسمت والے کو ہی ایسا دوست ملتا ہے۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب میرے دوسرے بڑے بھائی صاحبان اپنے دوستوں کا ذکر کرتے تو والد صاحب ان سے فرماتے کہ تمہارے دنیا میں بہت دوست ہیں، ساٹھ سال عمر ہو گئی ہمیں تو کوئی دوست نہیں ملا، ساری عمر میں صرف ڈیڑھ دوست ملا، ایک پورا اور ایک آدھا، مگر تمہیں بہت دوست مل جاتے ہیں۔ لہٰذا دوستی کے معیار پر پورا اترنے والا جو کٹھن آزمائش میں بھی پکّا اور کھرا ثابت ہو، ایسا دوست بہت کم ملتا ہے۔

بہرحال، اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنا کر بھی دوست بناؤ تو اس دوستی کے اندر بھی اس بات کا اہتمام کرو کہ وہ دوستی حدود سے تجاوز نہ کرے، بس وہ دوستی ایک حد کے اندر رہے، یہ نہ ہو کہ جب دوستی ہو گئی تو اب صبح سے لے کر شام تک ہر وقت اسی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے اور اسی کے ساتھ کھانا پینا ہے، اور اب اپنے راز بھی اس پر ظاہر کئے جارہے ہیں، اپنی ہر بات اس سے کہی جارہی ہے، اگر کل کو دوستی ختم ہو گئی تو چونکہ تم نے اپنے سارے راز اس پر ظاہر کردیئے ہیں، اب وہ تمہارے راز ہر جگہ اُچھالے گا اور تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس لئے دوستی اعتدال کے ساتھ ہونی چاہئے، یہ نہ ہو کہ آدمی حدود سے تجاوز کر جائے۔

دشمنی میں اعتدال

اسی طرح اگر کسی کے ساتھ دشمنی ہے اور کسی سے تعلقات اچھے نہیں ہیں تو یہ نہ ہو کہ اس کے ساتھ تعلقات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر ہر وقت کیڑے نکالے جارہے ہیں، اس کے ہر کام میں عیب تلاش کئے جارہے ہیں۔ ارے

بھائی! اگر کوئی آدمی بُرا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اچھائی بھی رکھی ہوگی، ایسا نہ ہو کہ عداوت کی وجہ سے تم اس کی اچھائیوں کو بھی نظر انداز کرتے چلے جاؤ۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿لا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا﴾ (سورۃ المائدہ: ۸)

یعنی کسی قوم کے ساتھ عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ بیشک اس کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے، لیکن اس دشمنی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب اس کی اچھائی کا بھی اعتراف نہ کیا جائے، بلکہ اگر وہ کوئی اچھا کام کرے تو اس کی اچھائی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ لیکن چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد عام طور پر ہمارے پیش نظر نہیں رہتا، اس لئے محبّتوں میں بھی حدود سے تجاوز ہوجاتا ہے اور بغض اور عداوت میں بھی حدود سے تجاوز ہوجاتا ہے۔

حجاج بن یوسف کی غیبت

آج حجاج بن یوسف کو کون مسلمان نہیں جانتا، جس نے بے شمار ظلم کئے، کتنے علماء کو شہید کیا، کتنے حافظوں کو قتل کیا، حتیٰ کہ اس نے کعبہ شریف پر حملہ کردیا۔ یہ سارے بُرے کام کئے اور جو مسلمان بھی اس کے ان بُرے افعال کو پڑھتا ہے تو اس کے دل میں اس کی طرف سے کراہیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سامنے حجاج بن یوسف کی بُرائی شروع کردی اور اس بُرائی کے اندر اس کی غیبت کی، تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فوراً ٹوکا اور فرمایا: کہ یہ مت سمجھنا کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم ہے تو اب اس کی غیبت حلال ہوگئی یا اس پر بہتان باندھنا حلال ہوگیا۔ یاد رکھو، جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حجاج بن یوسف سے اس کے ناحق قتل اور ظلم اور

خون کا بدلہ لیں گے تو تم اس کی جو غیبت کر رہے ہو یا بہتان باندھ رہے ہو تو اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ تم سے لیں گے۔ یہ نہیں کہ جو شخص بدنام ہوگیا تو اس کی بدنامی کے نتیجے میں اس پر جو چاہو الزام عائد کرتے چلے جاؤ، اس پر بہتان باندھتے چلے جاؤ اور اس کی غیبت کرتے چلے جاؤ۔ لہٰذا عداوت اور دشمنی بھی اعتدال کے ساتھ کرو اور محبت بھی اعتدال کے ساتھ کرو۔

ہمارے ملک کی سیاسی فضا کا حال

آج کل ہمارے یہاں جو سیاسی فضا ہے، اس سیاسی فضا کا حال یہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ تعلق ہوگیا اور اس کے ساتھ سیاسی وابستگی ہوگئی تو اس کو اس طرح بانس پر چڑھاتے ہیں کہ اب اس کے اندر کوئی عیب نظر نہیں آتا، اور اگر دوسرا شخص کوئی عیب بیان کرے تو اس کا سننا گوارہ نہیں ہوتا، اور اس کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی جاتی ہے کہ یہ معصوم عن الخطاء ہے۔ اور جب اس سے سیاسی دشمنی ہوجاتی ہے تو اب اس کے اندر کوئی اچھائی ہی نظر نہیں آتی۔ دونوں جگہ پر حدود سے تجاوز ہورہا ہے، اس طریقے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ بار بار عرض کرتا رہتا ہوں کہ صرف نماز روزے کا نام دین نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی دین کا حصہ ہے کہ محبت کرو تو اعتدال کے ساتھ کرو اور بغض رکھو تو اعتدال کے ساتھ رکھو۔ جو اللہ کے بندے ہیں وہ ان باتوں کو سمجھتے ہیں۔ یہ حکمران، یہ سیاسی لیڈر اور رہنما جو ہیں، ان کے ساتھ تعلق بھی باعزت فاصلے کے ساتھ ہو، یہ نہ ہو کہ جب ان کے ساتھ تعلق ہوگیا تو آدمی حد سے متجاوز ہورہا ہے۔

قاضی بکّار بن قتیبہؒ کا سبق آموز واقعہ

ایک قاضی گزرے ہیں قاضی بکّار بن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ، یہ بڑے درجے کے محدثین میں سے ہیں۔ دینی مدارس میں حدیث کی کتاب "طحاوی شریف" پڑھائی جاتی

ہے اس کے مصنف ہیں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ، یہ ان کے استاذ ہیں۔ ان کے زمانے میں جو بادشاہ تھا وہ ان پر مہربان ہوگیا، اور ایسا مہربان ہوگیا کہ ہر معاملے میں ان سے صلاح اور مشورہ ہورہا ہے، ہر معاملے میں ان کو بلایا جارہا ہے، ہر دعوت میں ان کو بلایا جارہا ہے، حتیٰ کہ ان کو پورے ملک کا قاضی بنادیا۔ اور اب سارے فیصلے ان کے پاس آرہے ہیں، دن رات بادشاہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے، جو سفارش کرتے ہیں بادشاہ ان کی سفارش کو قبول کرلیتا ہے۔ ایک عرصہ دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ اپنا قضا کا کام بھی کرتے رہے اور جو مناسب مشورہ ہوتا وہ بادشاہ کو دیدیا کرتے تھے۔

چونکہ وہ تو عالم اور قاضی تھے، بادشاہ کے غلام تو نہیں تھے، تو ایک مرتبہ بادشاہ نے غلط کام کردیا، قاضی صاحب نے فتویٰ دیدیا کہ بادشاہ کا یہ کام غلط ہے اور درست نہیں ہے، اور یہ کام شریعت کے خلاف ہے۔ اب بادشاہ سلامت ناراض ہوگئے کہ ہم اتنے عرصے تک ان کو کھلاتے پلاتے رہے، ان کو ہدیے تحفے دیتے رہے اور ان کی سفارش قبول کرتے رہے اور اب انہوں نے ہمارے خلاف ہی فتویٰ دیدیا۔ چنانچہ فوراً ان کو قاضی کے عہدے سے معزول کردیا۔ یہ دنیاوی بادشاہ بڑے تنگ ظرف ہوتے ہیں، دیکھنے میں بڑے سخی نظر آتے ہیں لیکن کم ظرف ہوتے ہیں، تو صرف یہ نہیں کیا کہ ان کو قضا کے عہدے سے معزول کردیا بلکہ ان کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ جاکر ان سے کہو کہ ہم نے آج تک تمہیں جتنے ہدیے تحفے دیئے ہیں وہ سب واپس کرو، اس لئے کہ اب تم نے ہماری مرضی کے خلاف کام شروع کردیا ہے۔ اب آپ اندازہ کریں کہ کئی سالوں کے وہ ہدایا، کبھی کچھ دیا ہوگا، کبھی کچھ بھیجا ہوگا، لیکن جب بادشاہ کا وہ آدمی آیا تو آپ اس آدمی کو اپنے گھر کے اندر ایک کمرے میں لے گئے اور ایک الماری کا تالہ کھولا تو وہ پوری الماری تھیلیوں سے بھری ہوئی تھی۔ آپ نے اس قاصد سے کہا کہ تمہارے بادشاہ کے پاس سے جو تحفے کی تھیلیاں آتی تھیں وہ سب اس الماری کے اندر رکھی ہوئی ہیں، اور ان تھیلیوں پر جو مہر لگی تھی

وہ مہر بھی ابھی تک نہیں ٹوٹی، یہ ساری تھیلیاں اٹھا کر لے جاؤ۔ اس لئے کہ جس دن بادشاہ سے تعلق قائم ہوا، الحمدللہ اسی دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ذہن میں تھا کہ "احبب حبیبک هونا ما عسٰی ان یکون بغیضک یوماما" اور مجھے اندازہ تھا کہ شاید کوئی وقت ایسا آئے گا کہ مجھے یہ سارے تحفے واپس کرنے پڑیں گے۔ الحمدللہ بادشاہ کے دیے ہوئے ہدیے اور تحفوں میں سے ایک ذرہ بھی آج تک اپنے استعمال میں نہیں لایا۔ یہ ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل کا صحیح نمونہ۔ یہ نہیں کہ جب دوستی ہوگئی تو اب ہر طرح کا فائدہ اٹھایا جارہا ہے اور جب دشمنی ہوئی تو اب پریشانی اور شرمندگی ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

یہ دعا کرتے رہو

اول تو صحیح معنیٰ میں محبت صرف اللہ جل شانہٗ سے ہونی چاہئے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی جو ہر مسلمان کو ہمیشہ مانگی چاہئے۔

﴿اللھم اجعل حبک احب الاشیاء الیّ﴾ (کنزالعمال ج ۲ ص ۱۸۲)

اے اللہ! اپنی محبت کو تمام محبتوں پر غالب فرما۔ اب انسان چونکہ کمزور ہے اور اس کے ساتھ بشری تقاضے لگے ہوئے ہیں، اس لئے انسان کو دوسروں سے بھی محبت ہوتی ہے۔ مثلاً بیوی سے محبت، اولاد سے محبت، دوستوں سے محبت، ماں باپ سے محبت، عزیز و رشتہ داروں سے محبت، یہ ساری محبتیں انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، یہ محبتیں انسان کے ساتھ رہیں گی اور کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ آدمی یہ دعا کرے کہ یا اللہ! یہ ساری محبتیں آپ کی محبت کے تابع ہوجائیں اور آپ کی محبت ان تمام محبتوں پر غالب آجائے۔

اگر محبّت حد سے بڑھ جائے تو یہ دعا کرو

اگر کسی سے محبت ہو اور یہ محسوس ہو کہ یہ محبّت حد سے بڑھ رہی ہے تو فوراً اللہ کی طرف رجوع کرو کہ یا اللہ! یہ محبت آپ نے میرے دل میں ڈالی ہے لیکن یہ محبت حد سے بڑھتی جارہی ہے، اے اللہ! کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کسی فتنے میں مبتلا ہوجاؤں۔ اے اللہ! اپنی رحمت سے مجھے فتنے میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھئے۔ اور پھر اپنے اختیاری طرز عمل میں بھی ہمیشہ احتیاط سے کام لو۔ جو آج کا دوست ہے وہ کل کا دشمن بھی ہوسکتا ہے، کل تک تو ہر وقت ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا، ساتھ کھانا پینا تھا، اور آج یہ نوبت آگئی کہ صورت دیکھنے کے روادار نہیں۔ یہ نوبت نہیں آنی چاہئے، اور اگر آئے تو اس کی طرف سے آئے، تمہاری طرف سے نہ آئے۔

بہرحال، دوستی کے بارے میں یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک تلقین ایسی ہے کہ اگر ہم ان کو پلّے باندھ لیں تو ہماری دنیا اور آخرت سنور جائے۔

دوستی کے نتیجے میں گناہ

بسا اوقات ان دوستیوں کے نتیجے میں ہم گناہ کے اندر مبتلا ہوجاتے ہیں، اور یہ سوچتے ہیں کہ چونکہ یہ دوست ہے اگر اس کی بات ہم نے نہ مانی تو اس کا دل ٹوٹے گا، لیکن اگر اس کے دل ٹوٹنے کے نتیجے میں شریعت ٹوٹ جائے تو اس کی پرواہ نہیں۔ حالانکہ شریعت کو ٹوٹنے سے بچانا دل کو ٹوٹنے سے بچانے سے مقدّم ہے بشرطیکہ شریعت میں گنجائش نہ ہو، لیکن اگر شریعت کے اندر گنجائش ہو تو اس صورت میں بیشک یہ حکم ہے کہ مسلمان کا دل رکھنا چاہئے اور حتی الامکان دل نہ توڑنا چاہئے، کیونکہ یہ بھی عبادت ہے۔

"غلو" سے بچیں

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں معاملات کے اندر "غلو" کرنے کی ممانعت ہے۔ کسی بھی معاملے میں غلو نہ ہو، نہ تعلقات میں اور نہ ہی معاملات میں۔ اور غلو کے معنیٰ ہیں "حد سے بڑھنا" کسی بھی معاملے میں انسان حد سے نہ بڑھے بلکہ مناسب حد کے اندر رہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

تعلقات کو نبھائیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی
وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب
اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تعلّقات کو نبھائیں

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکّل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیٔات اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضلّ لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھدان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ، صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرًاکثیرا۔

امابعد!

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿عن عائشۃ رضی اللّٰہ عنھا قالت: جاء ت عجوز الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال: کیف انتم، کیف حالکم، کیف کنتم بعدنا؟ قالت: بخیر بابی انت وامی یا رسول اللّٰہ! فلما خرجت قلت: یا رسول اللّٰہ! تقبل ھذہ العجوز ھذا الاقبال؟ فقال: یا عائشۃ! انھا کانت تاتینا زمان خدیجۃ وان حسن العھد من الایمان﴾ (بیہقی فی شعب الایمان)

خلاصہ حدیث

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عمر رسیدہ خاتون آئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بڑا اکرام اور استقبال کیا، ان کو عزت کے ساتھ بٹھایا، ان کی بڑی خاطر تواضع کی اور ان کی خیریت دریافت کی۔ جب وہ خاتون چلی گئیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے ان خاتون کے لئے بہت اکرام اور اہتمام فرمایا۔ یہ کون خاتون تھیں؟ جواب میں حضور

اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿انها کانت تاتینا زمان خدیجة﴾

یہ خاتون اس وقت ہمارے گھر آیا کرتی تھیں جب حضرت خدیجہؓ حیات تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ان کا تعلق تھا، گویا کہ یہ ان کی سہیلی تھیں، اس لئے میں نے ان کا اکرام کیا۔ پھر فرمایا:

﴿ان حسن العهد من الایمان﴾

یعنی کسی کے ساتھ اچھی طرح نباہ کرنا بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

تعلّقات نبھانے کی کوشش کرے

یعنی مؤمن کا کام یہ ہے کہ جب اس کا کسی کے ساتھ تعلّق قائم ہو تو اب حتی الامکان اپنی طرف سے اس تعلّق کو نہ توڑے، بلکہ اس کو نبھاتا رہے، چاہے طبیعت پر نبھانے کی وجہ سے گرانی بھی ہو، لیکن پھر بھی اس کو نبھاتا رہے، اور اس تعلّق کو بدمزگی پر ختم نہ کرے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرے کہ اگر کسی کے ساتھ تمہاری مناسبت نہیں ہے تو اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا زیادہ نہ کرے، لیکن ایسا تعلّق ختم کرنا کہ اب بول چال بھی بند، اور علیک سلیک بھی ختم، ملنا جلنا بھی ختم، ایک مؤمن کے لئے یہ بات مناسب نہیں،

اپنے گزرے ہوئے عزیزوں کے متعلّقین سے نباہ

اس حدیث میں ہمارے لئے دو سبق ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اپنے تعلّق والوں سے نباہ کرنا چاہئے بلکہ اپنے وہ عزیز جو پہلے گزر چکے ہیں، مثلاً ماں باپ ہیں یا بیوی ہے، تو ان کے اہل تعلّق سے بھی نباہ کرنا چاہئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صاحب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر عرض کیا کہ حضور میرے والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور میری طبیعت پر اس بات کا اثر ہے کہ میں زندگی میں ان کی خدمت نہیں کر سکا اور ان کی

قدر نہ کر سکا اور جیسے حقوق ادا کرنا چاہئے تھے اس طرح حقوق ادا نہ کر سکا۔ (جو لوگ زندگی میں والدین کی خدمت نہیں کرتے اکثر ان کے دلوں میں اس قسم کی حسرت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ان صاحب کے دل میں بھی اس کی حسرت تھی، اس لئے عرض کیا کہ میرے دل میں اس کی شدید حسرت ہے اور اثر ہے) اب میں کیا کروں۔ جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب تم یہ کرو کہ تمہارے والد کے جو دوست احباب ہیں اور جو ان کے تعلق والے اور ان کے قرابت دار ہیں، تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو، اس کے نتیجے میں تمہارے والد کی روح خوش ہوگی، اور تم نے اپنے والد کے اکرام اور حسن سلوک میں جو کوتاہی کی ہے، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی درجے میں اس کی تلافی فرمادیں گے۔ لہٰذا والدین اور اہل تعلقات کے انتقال کے بعد ان کے اہل تعلقات سے نباہ کرنا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور ان سے ملتے جلتے رہنا یہ بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔ یہ نہیں کہ جو آدمی مرگیا تو وہ اپنے اہل تعلقات کو بھی ساتھ لے گیا بلکہ اس کے اہل تعلقات تو دنیا میں موجود ہیں، تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ دیکھئے! حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو انتقال ہوئے بہت عرصہ گزر چکا تھا لیکن اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خاتون کا اکرام فرمایا۔ اس کے علاوہ بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سہیلیوں کے پاس ھدیے تحفے بھیجا کرتے تھے، صرف اس وجہ سے کہ ان کا تعلق حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تھا اور یہ ان کی سہیلیاں تھیں۔

تعلّق کو نبھانا سُنّت ہے

اس حدیث میں دوسرا سبق وہ ہے جو حدیث کے الفاظ "حسن العھد" سے معلوم ہورہا ہے۔ "حسن العھد" کے معنی ہیں، اچھی طرح نباہ کرنا، یعنی جب ایک مرتبہ کسی سے تعلّق قائم ہوگیا تو حتی الامکان اس تعلّق کو نبھاؤ اور جب تک ہوسکے اپنی طرف سے اس کو توڑنے سے پرہیز کرو۔ بالفرض اگر اس کی طرف

سے تمہیں تکلیفیں بھی پہنچ رہی ہیں تو یہ سمجھو کہ دوسرے کے ساتھ تعلق کو نبھانا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے، پھر سُنّت اور عبادت سمجھ کر اس تعلق کو نبھاؤ۔

خود میرا ایک واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہل تعلقات میں ایک صاحب تھے، ویسے تو وہ بڑے نیک آدمی تھے۔ لیکن بعض لوگوں کی اعتراض کرنے کی طبیعت ہوتی ہے، وہ جب بھی کسی سے ملیں گے تو اس پر کوئی نہ کوئی اعتراض کردیں گے اور کوئی طعنہ مار دیں گے، کوئی شکایت کردیں گے۔ بعض لوگوں کا ایسا مزاج ہوتا ہے۔ ان صاحب کا بھی ایسا ہی مزاج تھا، چنانچہ لوگ اس معاملے میں ان سے پریشان رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی اس عادت کے مطابق خود میرے ساتھ ایسی بات کی کہ وہ میری برداشت سے باہر ہوگئی، وہ بات میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس وقت تو میں اس بات کو پی گیا۔ میرے دماغ میں اس وقت یہ بات آئی کہ یہ صاحب کچھ اپنے مرتبے اور کچھ اپنے مال و دولت کے گھمنڈ میں دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں، اور اسی وجہ سے انہوں نے مجھ سے ایسی بات کی ہے۔ چنانچہ گھر واپس آکر میں نے ایک تیز خط لکھا اور اس خط میں یہ بات بھی لکھ دی کہ آپ کے مزاج میں یہ بات ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کو آپ سے شکایتیں رہتی ہیں۔ اور اب آج آپ نے میرے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا، یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اس لئے اب آئندہ میں آپ سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ خط لکھا۔

اپنی طرف سے تعلّق مت توڑو

لیکن چونکہ الحمدللہ میری عادت یہ تھی کہ جب کبھی کوئی ایسی بات سامنے آتی تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ضرور پیش کردیتا تھا۔ چنانچہ وہ خط لکھ کر حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ کی خدمت میں پیش کیا اور ان کو سارا

قصہ بھی سنایا کہ یہ بات ہوئی اور انہوں نے یہ رویّہ اختیار کیا، اور اب یہ بات میری برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔ چونکہ اس وقت میری طبیعت میں ہیجان اور اشتعال تھا، اس لئے والد صاحب نے اس وقت تو وہ خط لے کر رکھ لیا اور فرمایا کہ اچھا پھر کسی وقت بات کریں گے۔ یہ کہہ کر ٹلادیا۔ جب پورا ایک دن گزر گیا تو حضرت والد صاحب نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ تمہارا خط رکھا ہوا ہے اور میں نے پڑھ لیا ہے، اس خط سے تمہارا کیا مقصد ہے؟ میں نے کہا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ اب یہ خط ان کو بھیج کر تعلقات ختم کردیں۔ اس وقت حضرت والد صاحب نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ دیکھو کسی سے تعلّق توڑنا ایسا کام ہے کہ جب چاہو کرلو، اس میں کسی کے انتظار کی یا وقت کی ضرورت نہیں، اس میں کوئی لمبا چوڑا کام نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن تعلّق جوڑنا ایسا کام ہے جو ہر وقت نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا تمہیں اس کی جلدی کیا ہے کہ یہ خط ابھی بھیجنا ہے، ابھی کچھ دن اور انتظار کرلو اور دیکھ لو، البتہ اگر ان سے ملنے کا دل نہیں چاہتا تو ان کے پاس مت جاؤ، لیکن اس طرح خط لکھ کر باقاعدہ قطع تعلّق کرلینا تو یہ اپنی طرف سے تعلّق ختم کرنے کی بات ہوئی۔

تعلّق توڑنا آسان ہے، جوڑنا مشکل ہے

پھر فرمایا کہ: تعلّق ایسی چیز ہے کہ جب ایک مرتبہ قائم ہوجائے تو حتی الامکان اس تعلّق کو نبھاؤ۔ تعلّق کو توڑنا آسان ہے، جوڑنا مشکل ہے۔ اگر تمہاری طبیعت ان کے ساتھ نہیں ملتی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ تم صبح و شام ان کے پاس جایا کرو بلکہ طبیعت نہیں ملتی تو مت جاؤ، لیکن جب تعلّق قائم ہے تو اپنی طرف سے قطع کرنے کی کوشش نہ کرو۔ پھر ایک دوسرا خط نکال کر دکھایا جو خود لکھا تھا اور فرمایا کہ اب میں نے یہ دوسرا خط لکھا ہے، اس خط کو پڑھو اور اپنے خط کو پڑھو، تمہارا خط تعلّقات کو ختم کرنے والا ہے، اور میرا خط پڑھو، میرے خط کے اندر بھی شکایت کا اظہار ہوگیا اور یہ بات بھی اس میں آگئی کہ ان کا یہ طریقہ اور رویّہ تمہیں ناگوار ہوا، معاملے کی بات پوری آگئی لیکن اس خط نے تعلّقات کو ختم نہیں کیا۔ چنانچہ وہ خط

لے کر میں نے پڑھا تو میرے خط میں اور حضرت کے خط میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہم نے اپنے جذبات اور اشتعال میں آکر وہ خط لکھ دیا تھا اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے مطابق بات نبھانے کے لئے اس طرح خط لکھا کہ شکایت اپنی جگہ ہوگئی اور ان کے جس طرزِ عمل سے ناگواری ہوئی تھی، اس کا بھی اظہار ہوگیا کہ آپ کی یہ بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ لیکن آئندہ کے لئے قطع تعلق کی جو بات تھی وہ اس میں سے کاٹ دی۔

پھر فرمایا: دیکھو یہ پُرانے تعلّقات ہیں اور ان صاحب سے تعلّق میرا اپنا ذاتی تعلّق نہیں ہے بلکہ ہمارے والد صاحب کے وقت سے یہ تعلّق چلا آرہا ہے۔ ان کے والد صاحب سے ہمارے والد صاحب کا تعلّق تھا۔ اب اتنے پرانے تعلّق کو ایک لمحے میں کاٹ کر ختم کردینا یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

عمارت ڈھانا آسان ہے

بہرحال، حضرت والد صاحب نے یہ جملہ جو ارشاد فرمایا تھا کہ تعلّقات کو توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے۔ یہ ایسا جملہ فرمادیا کہ آج یہ جملہ دل پر نقش ہے۔ ایک عمارت کھڑی ہوئی ہے، اس عمارت کو کلہاڑے سے ڈھادو، وہ عمارت دو دن کے اندر ختم ہوجائے گی۔ لیکن جب تعمیر کرنے لگوگے تو اس میں کئی سال خرچ ہوجائیں گے۔ لہٰذا کوئی بھی تعلّق ہو اس کو توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے۔ اس لئے تعلّق توڑنے کے لئے پہلے ہزار مرتبہ سوچو۔ اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان حسن العهد من الایمان یعنی اچھی طرح نبھاؤ کرنا یہ ایمان کا تقاضہ ہے۔

اگر تعلّقات سے تکلیف پہنچے تو

فرض کریں کہ اگر آپ کو تعلّق کی وجہ سے دوسرے سے تکلیف بھی پہنچ رہی ہے تو یہ سوچو کہ تمہیں جتنی تکلیفیں پہنچیں گی، تمہارے درجات میں اتنا ہی اضافہ

ہوگا، تمہارے ثواب میں اضافہ ہوگا۔ اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کسی مؤمن کو ایک کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ کانٹا اس کے ثواب اور اس کے درجات میں اضافہ کرتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی سے تمہیں تکلیف پہنچ رہی ہے اور تم اس پر صبر کررہے ہو تو اس صبر کا ثواب تمہیں مل رہا ہے، اور اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ان حسن العهد من الایمان پر عمل کرنے کی نیت ہے تو اس صورت میں اتباع سُنّت کا اور زیادہ ثواب تمہیں مل رہا ہے۔

تکالیف پر صبر کرنے کا بدلہ

لہٰذا یہاں جو تکلیفیں تمہیں پہنچ رہی ہیں وہ اس دنیا میں رہ جائیں گی، یہ تو تھوڑی دیر اور تھوڑے وقت کی ہیں لیکن اس کا جو اجر و ثواب تم اپنی قبر میں سمیٹ کر لے جاؤ گے اور جو اجر و ثواب اللہ تعالیٰ تمہیں آخرت میں عطا فرمائیں گے، وہ اجر و ثواب انشاء اللہ ان تکلیفوں کے مقابلے میں اتنا زیادہ ہوگا کہ اس کے سامنے ان تکلیفوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے روز صبر کرنے والوں کو اپنی رحمتوں سے نوازیں گے اور ان کو صبر کا صلہ عطا فرمائیں گے تو جو لوگ دنیا میں آرام اور راحت سے رہے ہیں وہ تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالوں کو قینچیوں سے کاٹا گیا ہوتا اور اس پر ہم صبر کرتے اور ہمیں بھی اتنا ہی ثواب ملتا جتنا ان لوگوں کو مل رہا ہے۔ اس طرح لوگ حسرت کریں گے، اس لئے جو یہ تکلیفیں تھوڑی بہت پہنچ رہی ہیں ان کو برداشت کرلو۔

تعلّق کو نباہنے کا مطلب

لیکن نباہ کرنے کے معنی سمجھ لینا چاہئے۔ نباہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حقوق ادا کرتے رہو اور اس سے تعلّق ختم نہ کرو۔ لیکن نباہ کرنے کے لئے دل میں

مناسبت کا پیدا ہونا اور اس کے ساتھ دل کا لگنا اور طبیعت میں کسی قسم کی الجھن کا باقی نہ رہنا ضروری نہیں۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ دن رات ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا باقی رہے اور ان کے ساتھ ہنسنا بولنا اور ملنا جلنا باقی رہے۔ نباہ کے لئے ان چیزوں کا باقی رکھنا ضروری نہیں بلکہ تعلقات کو باقی رکھنے کے لئے حقوق شرعیہ کی ادائیگی کافی ہے۔ لہٰذا آپ کو اس بات پر کوئی مجبور نہیں کرتا کہ آپ کا دل تو فلاں کے ساتھ نہیں لگتا لیکن آپ زبردستی اس کے ساتھ جاکر ملاقات کریں۔ یا آپ کی ان کے ساتھ مناسبت نہیں ہے تو اب کوئی اس پر مجبور نہیں کرتا کہ آپ طبیعت کے خلاف ان کے پاس جاکر بیٹھیں۔ بس صرف ان کے حقوق ادا کرتے رہیں اور قطع تعلق نہ کریں۔ بس ان حسن العهد من الایمان کے یہی معنی ہیں۔

یہ سُنّت چھوڑنے کا نتیجہ ہے

بہرحال، ہمارے آپس کے تعلقات میں دن رات لڑائیاں اور جھگڑے اٹھتے رہتے ہیں، وہ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سُنّت کو چھوڑنے اور آپ کی ہدایات اور تعلیمات کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر ایک وہ حدیث جو پچھلے بیان میں پڑھی تھی اور ایک یہ حدیث جو آج پڑھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم ان دونوں حدیثوں کو پلّے باندھ لیں اور ان کی حقیقت سمجھ لیں اور ان پر عمل کرلیں تو ہمارے معاشرے کے بے شمار جھگڑے ختم ہوجائیں۔ وہ یہ کہ محبّت کرو تو اعتدال سے کرو اور بغض کرو تو اعتدال سے کرو۔ شریعت کی ساری تعلیم یہ ہے کہ اعتدال سے کام لو اور کہیں بھی حد سے متجاوز نہ ہوجاؤ۔ اور یہ کہ جب کسی سے تعلّق قائم ہوجائے تو اس تعلّق کو نباہنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے مجھے اور آپ سب کو ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مرنے والوں کی بُرائی نہ کریں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مرنے والوں کو بُرا مت کہو

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیٰات اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ، صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا۔

امابعد!

﴿عن المغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ تعالی عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لاتسبوا الاموات فتوذوا الاحیاء﴾

(ترمذی کتاب البر، باب ماجاء فی الشتم)

مرنے والوں کو بُرا مت کہو

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں کا انتقال ہوچکا ہے، ان کو بُرا مت کہو، اس لئے کہ مردوں کو بُرا کہنے سے زندہ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔

ایک اور حدیث جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اذکروا محاسن موتٰکم وکفوا عن مساویھم﴾

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی النھی عن سب الموتی)

"یعنی اپنے مردوں کی اچھائیاں ذکر کرو، اور ان کی برائیاں ذکر کرنے سے باز رہو"۔

یہ دو حدیثیں ہیں، دونوں کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہے کہ جب کسی کا انتقال ہوجائے تو انتقال کے بعد اگر اس کا ذکر کرنا ہے تو اچھائی سے ذکر کرو، بُرائی سے ذکر مت کرو۔ چاہے بظاہر اس کے اعمال کتنے بھی خراب رہے ہوں، لیکن تم اس کی اچھائی کا ذکر کرو اور بُرائی کا ذکر مت کرو۔

مرنے والے سے معاف کرانا ممکن نہیں

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم تو زندوں کے لئے بھی ہے کہ زندوں کا ان کے پیچھے بُرائی سے تذکرہ کرنا جائز نہیں، بلکہ زندوں کا تذکرہ بھی اچھائی سے کرنا چاہئے، اگر بُرائی سے ذکر کریں گے تو غیبت ہوجائے گی، اور غیبت حرام ہے۔ پھر ان احادیث میں خاص طور پر مُردوں کے بارے میں یہ کیوں فرمایا کہ مُردوں کا ذکر بُرائی سے مت کرو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ زندہ آدمی کی غیبت بھی حرام ہے، لیکن مردہ آدمی کی غیبت ڈبل حرام ہے، اس کی حرمت کہیں زیادہ ہے۔ اس کی کئی وجہ ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زندہ آدمی کی غیبت کرے تو امید یہ ہے کہ جب اس سے کسی وقت ملاقات ہوگی تو اس سے معافی مانگ لے گا اور وہ معاف کردے گا، اس طرح غیبت کرنے کا گناہ ختم ہوجائے گا۔ کیونکہ غیبت حقوق العباد میں سے ہے، اور حقوق العباد کا معاملہ یہ ہے کہ اگر صاحب حق معاف کردے تو معاف ہوجاتا ہے۔ لیکن جس شخص کا انتقال ہوگیا، اس سے معافی مانگنے کا کوئی راستہ نہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں جاچکا، اس وجہ سے وہ گناہ معاف ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے یہ گناہ ڈبل ہوگیا۔

اللہ کے فیصلے پر اعتراض

مرنے والے کی غیبت منع ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اب تو وہ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکا ہے، اور تم اس کی جس بُرائی کا ذکر کررہے ہو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس بُرائی کو معاف کردیا ہو اور اس کی مغفرت کردی ہو۔ تو اس

صورت میں اللہ تعالیٰ نے تو معاف کردیا، اور تم اس کی بُرائی لئے بیٹھے ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض ہو رہا ہے کہ یا اللہ! آپ نے تو اس بندے کو معاف کردیا، لیکن میں معاف نہیں کرتا، وہ تو بہت بُرا تھا۔ استغفر اللہ، یہ اور بڑا گناہ ہے۔

زندہ اور مُردہ میں فرق

تیسری وجہ یہ ہے کہ زندہ آدمی کی "غیبت" میں بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو جائز ہوتی ہیں، مثلاً ایک آدمی کی عادت خراب ہے، اس عادت کے خراب ہونے کی وجہ سے اندیشہ یہ ہے کہ لوگ اس سے دھوکہ میں مبتلا ہوجائیں گے یا وہ کسی کو تکلیف پہنچائے گا۔ اب اگر اس کے بارے میں کسی کو بتادیا کہ دیکھو اس سے ہوشیار رہنا اس کی یہ عادت ہے، یہ غیبت جائز ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد دوسرے کو نقصان سے بچانا ہے۔ لیکن جس آدمی کا انتقال ہوگیا ہے، وہ اب کسی دوسرے کو نہ تو تکلیف پہنچا سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دھوکہ دے سکتا ہے، اس لئے اس کی غیبت کسی بھی وقت حلال نہیں ہوسکتی۔ اس وجہ سے خاص طور پر فرمایا کہ مرنے والوں کی غیبت مت کرو۔ اور نہ بُرائی سے ان کا تذکرہ کرو۔

اس کی غیبت سے زندوں کو تکلیف

چوتھی وجہ خود حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادی، وہ یہ کہ تم نے یہ سوچ کر مردے کی غیبت کی کہ وہ مردہ تو اب اللہ تعالیٰ کے یہاں جاچکا ہے، میری بُرائی کرنے سے اس کو نہ تو تکلیف پہنچے گی، اور نہ ہی اس کو اطلاع ہوگی۔ لیکن تم نے یہ نہ سوچا کہ آخر اس مردے کے کچھ چاہنے والے بھی تو دنیا میں ہوں گے، جب ان کو یہ پتہ چلے گا کہ ہمارے فلاں مرنے والے قریبی عزیز کی بُرائی بیان کی گئی ہے تو اس کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوگی۔ فرض کریں کہ آپ نے کسی زندہ آدمی کی غیبت کرلی ہے تو آپ کے لئے یہ آسان ہے کہ جاکر اسی

سے معافی مانگ لیں، وہ معاف کردے گا تو بات ختم ہوجائے گی۔ لیکن اگر آپ نے کسی مردہ آدمی کی غیبت کرلی تو اس غیبت سے اس کے جتنے عزیز واقارب، دوست احباب ہیں، ان سب کو تکلیف ہوگی۔ اب تم کہاں کہاں جاکر اس کے عزیز و اقارب کو تلاش کروگے، اور یہ تحقیق کروگے کہ کس کس کو تکلیف پہنچی ہے، اور پھر کس کس سے جاکر معافی مانگو گے۔ اس لئے مردے کی غیبت کرنے کی برائی بہت زیادہ شدید ہے۔ لہٰذا زندہ آدمی کی غیبت تو حرام ہے ہی، لیکن مرنے والے کی غیبت اس کے مقابلہ میں زیادہ حرام ہے، اور اس کی معافی بھی بہت مشکل ہے۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں کی بُرائی بیان نہ کرو، صرف اچھائی بیان کرو۔

مردہ کی غیبت جائز ہونے کی صورت

صرف ایک صورت میں مردے کی بُرائی بیان کرنا جائز ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص گمراہی کی باتیں کتابوں میں لکھ کر دنیا سے رخصت ہوگیا، اب اس کی کتابیں ہر جگہ پھیل رہی ہیں، ہر آدمی اس کی کتابیں پڑھ رہا ہے۔ لہٰذا اس شخص کے بارے میں لوگوں کو یہ بتانا کہ اس شخص نے عقائد کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں، وہ غلط ہیں اور گمراہی کی باتیں ہیں، تاکہ لوگ اس کی کتابیں پڑھ کر گمراہی میں مبتلا نہ ہوں۔ بس اس حد تک اس کی بُرائی بیان کرنے کی اجازت ہے۔ اس میں یہ بھی ضروری ہے کہ اس حد تک اس کے بارے میں لوگوں کو بتایا جائے جس حد تک ضرورت ہو۔ لیکن اس شخص کو بُرا بھلا کہنا یا اس کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنا جو گالی میں داخل ہوجائیں، یہ عمل پھر بھی جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اگرچہ وہ اپنی کتابوں میں گمراہی کی باتیں لکھ گیا، لیکن کیا معلوم کہ مرتے وقت اس کو اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق دیدی ہو، اور اس توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف فرمادیا ہو۔ لہٰذا اس کے لئے بُرے الفاظ استعمال کرنا مثلاً یہ کہنا کہ وہ تو جہنمی تھا، وغیرہ۔ العیاذ باللہ۔ یہ کسی طرح جائز نہیں۔ کیونکہ کسی کے جہنمی ہونے یا نہ ہونے کا

فیصلہ صرف ایک ذات کے اختیار میں ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون جنتی ہے؟ اور کون جہنمی ہے؟ لہٰذا تم اس کے اوپر جہنمی ہونے کا فیصلہ کرنے والے کون ہو؟ اور تم نے اس کے بارے میں یہ کیسے فیصلہ کرلیا کہ وہ مردود تھا۔ اس قسم کے الفاظ اس کے بارے میں استعمال کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ البتہ اس نے جو گمراہی پھیلائی ہے، اس کی تردید کردو کہ یہ اس کے عقائد گمراہانہ تھے، اور کوئی شخص ان عقائد سے دھوکہ میں نہ آئے۔

اچھے تذکرہ سے مُردے کا فائدہ

لہٰذا جو بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی، یہ یاد رکھنے کی ہے کہ مرنے والوں کے محاسن ذکر کرو اور اس کی بُرائیوں کو ذکر کرنے سے پرہیز کرو۔ اس حدیث شریف میں صرف بُرائیوں سے پرہیز کرنے کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کہ اس کی اچھائیاں ذکر کرو، اس کی اچھائیاں ذکر کرنے کی ترغیب دی۔ میں نے اپنے بعض بزرگوں سے اس کی حکمت یہ سنی ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی مرنے والے کی کوئی اچھائی ذکر کرتا ہے، یا اس کی نیکی کا تذکرہ کرتا ہے تو یہ اس مرنے والے کے حق میں ایک گواہی ہوتی ہے، اور اسی گواہی کی بنیاد پر بعض اوقات اللہ تعالیٰ اس مرنے والے پر فضل فرمادیتے ہیں کہ میرے نیک بندے تمہارے بارے میں اچھائی کی گواہی دے رہے ہیں، چلو ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔ لہٰذا اچھائی کا ذکر کرنا مرنے والے کے حق میں بھی فائدہ مند ہے۔ اور جب تمہاری گواہی کے نتیجے میں اس کو فائدہ پہنچ گیا، تو کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے نتیجے میں تمہاری بھی مغفرت فرمادیں، اور یہ فرمادیں کہ تم نے میرے ایک بندے کو فائدہ پہنچایا، لہٰذا ہم تمہیں بھی فائدہ پہنچاتے ہیں اور تمہیں بھی بخش دیتے ہیں۔ اس لئے فرمایا نہ صرف یہ نہیں کہ مرنے والے کا بُرائی کے ساتھ تذکرہ مت کرو، بلکہ فرمایا کہ اس کی اچھائیاں ذکر کرو، اس سے انشاء اللہ ان کو بھی فائدہ پہنچے گا اور تمہیں بھی فائدہ پہنچے گا۔

مرنے والوں کے لئے دعائیں کرو

ایک اور حدیث بھی اسی مضمون کی ہے لیکن الفاظ دوسرے ہیں۔ وہ یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:

﴿لاتذکروا ھلکاکم الا بخیر﴾

(النسائی، کتاب الجنائز، باب النھی عن ذکر الھلکی الابخیر)

یعنی اپنے مرنے والوں کا ذکر مت کرو مگر اچھائی کے ساتھ۔ اور اچھائی کے ساتھ ذکر میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جب اس کی اچھائی ذکر کر رہے ہو تو اس کے حق میں یہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے اور اس پر اپنا فضل فرمائے، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عذاب سے محفوظ فرمائے۔ یہ دعائیں ڈبل فائدہ دیں گی، ایک تو دعا کرنا بذات خود عبادت اور ثواب ہے، چاہے وہ کسی کام کے لئے بھی کرے۔ دوسرے کسی مسلمان کو فائدہ پہنچانے کا اجر و ثواب بھی حاصل ہو جائے گا۔ اس لئے اس کے حق میں دعا کرنے میں آپ کا بھی فائدہ ہے اور اس کا بھی فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بحث و مباحثہ اور جھوٹ ترک کیجئے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بحث ومباحثہ اور جھوٹ ترک کیجئے

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیاٰت اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھدان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ، صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا۔ اما بعد!

﴿عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لایؤمن العبد الایمان کلہ حتی یترک الکذب فی المزاحۃ ویترک المراء وان کان صادقا﴾ (مسند احمد، جلد ۲ صفحہ ۳۵۲)

ایمان کامل کی دو علامتیں

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مذاق میں بھی جھوٹ بولنا نہ چھوڑے، اور بحث ومباحثہ نہ چھوڑے، چاہے وہ حق پر ہو۔ اس حدیث میں دو چیزیں بیان فرمائیں کہ جب تک آدمی ان دو چیزوں کو نہیں چھوڑے گا، اس وقت تک آدمی صحیح طور پر مؤمن نہیں ہو سکتا، ایک یہ کہ مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے، اور دوسرے یہ کہ حق پر ہونے کے باوجود بحث ومباحثہ میں نہ پڑے۔

مذاق میں جھوٹ بولنا

پہلی چیز جس کا اس حدیث میں حکم دیا، وہ ہے جھوٹ چھوڑنا، اور اس میں بھی خاص طور پر مذاق میں جھوٹ بولنے کا ذکر فرمایا، اس لئے کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ اسی وقت ناجائز اور حرام ہے جب وہ سنجیدگی سے بولا جائے اور مذاق میں جھوٹ بولنا جائز ہے، چنانچہ اگر کسی سے کہا جائے کہ تم نے فلاں موقع پر یہ بات کہی تھی، وہ تو ایسی نہیں تھی، تو جواب میں وہ کہتا ہے کہ میں تو مذاق میں یہ بات کہہ رہا تھا۔ گویا کہ مذاق میں جھوٹ بولنا کوئی بُری بات ہی نہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن ایسا ہونا چاہئے کہ اس کی زبان سے خلاف واقعہ بات نکلے ہی نہیں، حتیٰ کہ مذاق میں بھی نہ نکلے۔ اگر مذاق اور خوش طبعی حد کے اندر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، شریعت نے خوش طبعی اور مذاق کو جائز قرار دیا ہے، بلکہ اس کی تھوڑی سی ترغیب بھی دی ہے، ہر وقت آدمی خشک اور سنجیدہ ہو کر بیٹھا رہے کہ اس کے منہ پر کبھی تبسم اور مسکراہٹ ہی نہ آئے، یہ بات پسندیدہ نہیں۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق کرنا ثابت ہے، لیکن ایسا لطیف مذاق اور ایسی خوش طبعی کی باتیں آپ سے منقول ہیں جو لطیف بھی ہیں اور ان میں کوئی بات خلاف واقعہ بھی نہیں۔

حضور ﷺ کے مذاق کا ایک واقعہ

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صاحب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے ایک اونٹ دے دیجئے۔ اس زمانے میں اونٹ سب سے بڑی دولت ہوتی تھی اور مالداری کی علامت سمجھی جاتی تھی، جس کے پاس جتنے زیادہ اونٹ ہوتے تھے وہ اتنا ہی بڑا مالدار ہوتا تھا۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں اونٹنی کا بچہ دونگا، ان صاحب نے کہا یا رسول اللہ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا، مجھے تو اونٹ چاہئے

جو مجھے سواری کے کام آسکے۔ آپ نے فرمایا کہ ارے جو بھی اونٹ ہوگا وہ بھی تو اونٹنی کا بچہ ہی ہوگا۔ (مشکوٰۃ: صفحہ۴۱۶)

دیکھئے، آپ نے مزاح فرمایا اور خوش طبعی کی بات فرمائی، لیکن حق بات کہی، کوئی جھوٹ اور خلاف واقعہ بات نہیں کہی۔

حضور ﷺ کے مذاق کا دوسرا واقعہ

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک خاتون حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنّت میں داخل فرمادیں، آپ نے فرمایا کہ کوئی بوڑھی جنّت میں نہیں جائے گی، جب آپ نے دیکھا کہ وہ پریشان ہو رہی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی خاتون بڑھاپے کی حالت میں جنّت میں نہیں جائے گی بلکہ جوان ہو کر جائے گی۔ (مشکوٰۃ: صفحہ۴۱۶)

دیکھئے، آپ نے مذاق فرمایا اور خوش طبعی کی بات کی، لیکن اس میں کوئی جھوٹ اور غلط بیانی کا پہلو نہیں تھا۔ یہ مذاق کرنا بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے لہٰذا جب کوئی شخص اتباع سُنّت کی نیت سے مذاق کرے گا تو انشاء اللہ اس پر ثواب کی بھی امید ہے۔ ہمارے جتنے بزرگ گزرے ہیں ان سب کا حال یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی خشک نہیں تھا، ایسا خشک کہ بت بنے بیٹھے ہیں اور زبان پر خوش طبعی کی بات ہی نہیں آتی، بلکہ یہ حضرات اپنے ساتھیوں سے خوش طبعی کی اور دل لگی کی باتیں بھی کیا کرتے تھے، اور بعض بزرگ تو اس بارے میں مشہور تھے، لیکن اس خوش طبعی اور مذاق میں جھوٹ نہیں ہوتا تھا، اور جب اللہ تعالیٰ کسی پر اپنا فضل فرماتے ہیں تو اس کی زبان اس طرح کردیتے ہیں کہ اس زبان پر کبھی جھوٹ کی کوئی بات آتی ہی نہیں، نہ مذاق میں نہ ہی سنجیدگی میں۔

حضرت حافظ ضامن شہیدؒ اور دل لگی

تھانہ بھون کے اقطاب ثلاثہ مشہور ہوئے ہیں، ان میں سے ایک حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے، بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے تھے، ان کے بارے میں بعض بزرگوں کا یہ مکاشفہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جو جہاد ہوا تھا، وہ اسی دولہا کی برات سجانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا تھا، لیکن ان کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی ان کی مجلس میں جاکر بیٹھتا تو دیکھتا کہ وہاں تو ہنسی مذاق اور دل لگی ہو رہی ہے۔ جب کوئی شخص ان کے پاس جاتا تو فرماتے کہ بھائی اگر فتویٰ لینا ہو تو دیکھو سامنے مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب بیٹھے ہیں، ان کے پاس چلے جاؤ۔ اگر ذکر واذکار سیکھنا ہو اور بیعت ہونا ہو تو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (رحمۃ اللہ علیہ) تشریف فرما ہیں، ان سے جاکر تعلق قائم کرلو، اور حقہ پینا ہو تو یاروں کے پاس آجاؤ۔ اس طرح کی دل لگی کی باتیں کیا کرتے تھے، لیکن اس دل لگی کے پردے میں اپنے باطن کے مقام بلند کو چھپایا ہوا تھا۔

حضرت محمد بن سیرینؒ اور قہقہے

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں، ان کے حالات میں ان کے بارے میں کسی نے لکھا ہے کہ "کنا نسمع ضحکه فی النهار وبکاءه باللیل" یعنی دن کے وقت ہم ان کے ہنسنے کی آوازیں سنا کرتے تھے، اور ان کی مجلس میں قہقہے گونجتے تھے اور رات کے وقت ان کے رونے کی آوازیں آیا کرتی تھیں، اللہ تعالیٰ کے حضور جب سجدہ ریز ہوتے تو روتے رہتے تھے۔

حدیث میں خوش طبعی کی ترغیب

بہرحال، یہ مذاق اپنی ذات میں برا نہیں بشرطیکہ حدود کے اندر ہو، اور آدمی ہر

وقت ہی مذاق نہ کرتا رہے، بلکہ کبھی کبھی مذاق اور دل لگی کرنی چاہئے۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿روحوا القلوب ساعة فساعة﴾

یعنی "اپنے دلوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے آرام دیا کرو"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ کاموں میں لگا ہوا ہے تو تھوڑا وقت وہ ایسا بھی نکالے جس میں آزادی سے خوش طبعی کی باتیں بھی کرلے، گویا کہ یہ بھی مطلوب ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے، لیکن اس کا خیال رہے کہ کسی بھی وقت منہ سے غلط بات نہ نکلے۔ بہرحال، جب مذاق میں جھوٹ بولنے کو منع کیا گیا ہے تو سنجیدگی میں جھوٹ بولنا کتنی بُری بات ہوگی، اور مؤمن کی بنیادی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ اس کے منہ سے غلط بات نہیں نکلتی، حتیٰ کہ جان پر مصیبت آجاتی ہے اس وقت بھی مؤمن جھوٹ سے بچتا ہے، حالانکہ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے کہ جان بچانے کی خاطر اگر کوئی شخص جھوٹ بولے تو اس کی اجازت ہے، لیکن جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں، اس وقت بھی ان کے منہ پر صریح جھوٹ جاری نہیں ہوتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرت کے سفر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جارہے تھے، مکہ مکرمہ کے کافروں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑنے کے لئے ہرکارے دوڑائے ہوئے تھے، اور یہ اعلان کیا ہوا تھا کہ جو شخص آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پکڑ کر لائے گا اس کو سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ کتنا بڑا انعام تھا، آج بھی سو اونٹ کی قیمت لاکھوں تک پہنچ جائے گی۔ اور سارا مکہ اس فکر میں تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کہیں سے

پکڑ لائیں، اس حالت میں ایک شخص آپ تک پہنچ گیا، وہ شخص حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جانتا تھا، لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے واقف نہیں تھا، اس نے پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ اب اگر صحیح بتاتے ہیں تو جان کا خطرہ ہے، اور اگر نہیں بتاتے ہیں تو غلط بیانی اور جھوٹ ہوتا ہے، جو لوگ سچ بولنے کا اہتمام کرتے ہیں، ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرماتے ہیں، آپ تو "صدیق" (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تھے، چنانچہ اس شخص کے سوال کے جواب میں آپ کے منہ سے یہ نکلا کہ "ھاد یھدینی السبیل" یہ رہنما ہیں اور مجھے راستہ دکھلاتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ آپ نے ایک ایسا جملہ بول دیا جس میں جھوٹ کا شائبہ بھی نہیں تھا، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی رہنما تھے اور دین کا راستہ دکھلاتے تھے، اور جان بھی بچ گئی۔ دیکھئے! جان پر بنی ہوئی ہے، مگر اس وقت بھی زبان پر صریح جھوٹ نہیں آرہا ہے، حالانکہ ایسے موقع پر جبکہ جان کا خطرہ ہو، شریعت نے جھوٹ بولنے کی گنجائش دیدی ہے، لیکن صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زبان سے جھوٹ کا کلمہ نہیں نکالا۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے، ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کے موقع پر ان کی گرفتاری کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے، اس وقت یہ عالم تھا کہ چوراہوں پر پھانسیوں کے تختے لٹکے ہوئے تھے، اور جب کسی کے بارے میں پتہ چلتا کہ یہ جہاد میں شریک ہے، اس کو فوراً پکڑ کر چوراہے پر پھانسی دے دی جاتی تھی، اس حالت میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں چھتے کی مسجد میں تشریف فرما تھے، آپ بالکل سادہ رہتے تھے، اور عام طور پر آپ تہبند اور معمولی کرتا پہنے رہتے تھے، دیکھنے میں پتہ نہیں چلتا تھا کہ آپ اتنے بڑے علامہ ہوں گے۔ ایک دن آپ کو گرفتار کرنے کے لئے پولیس مسجد کے اندر پہنچ گئی، اندر جاکر دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا۔ پولیس والوں کے ذہن میں یہ تھا

کہ مولانا محمد قاسم صاحب بہت بڑے علامہ ہوں گے، اور آپ جبہ اور پگڑی پہنے ہوئے شان و شوکت کے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔ لیکن اندر مسجد میں دیکھا کہ ایک آدمی لنگی اور معمولی کرتا پہنے ہوئے ہے، پولیس والے یہ سمجھے کہ یہ مسجد کا کوئی خادم ہے، ان سے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کہاں ہیں؟ اب اگر یہ جواب دیتے ہیں کہ میں ہی ہوں تو پکڑے جاتے ہیں اور اگر کوئی اور بات کہتے ہیں تو جھوٹ ہوجاتا ہے۔ آپ نے یہ کیا کہ جس جگہ پر کھڑے تھے اس جگہ سے ذرا سے پیچھے ہٹ گئے اور پھر کہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہیں تھے، یہ جواب دیا۔ آپ دیکھیں کہ ایسے وقت میں جبکہ پھانسی دیے جانے کا خطرہ آنکھوں کے سامنے ہے، اور موت آنکھوں کے سامنے رقص کررہی ہے، اس وقت بھی صریح جھوٹ زبان سے نہیں نکالا، اسی کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے بچالیا، اور اس پولیس کے دل میں یہ بات آگئی کہ ہوسکتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں ہوں گے اور اب کہیں نکل گئے۔ بہرحال، جھوٹ ایسی چیز ہے کہ ایک مؤمن تختہ دار پر بھی اس کو کبھی گوارہ نہیں کرتا۔

آج معاشرے میں پھیلے ہوئے جھوٹ

اس لئے حتی الامکان جہاں تک ہوسکے انسان جھوٹ نہ بولے۔ جب شریعت نے سچ بولنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے اور جھوٹ بولنے کی ممانعت فرمائی ہے، حتی کہ مذاق میں اور حالت جنگ میں بھی جھوٹ کی ممانعت فرمائی ہے تو عام حالات میں جھوٹ کی اجازت کیسے ہوگی؟ آجکل ہمارا معاشرہ جھوٹ سے بھر گیا ہے، اچھے خاصے پڑھے لکھے دیندار، اور اہل اللہ سے تعلق رکھنے والے صحبت یافتہ لوگ بھی صریح جھوٹ کا ارتکاب کرتے ہیں، مثلاً چھٹی لینے کے لئے جھوٹے میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوا رہے ہیں، اور دل میں ذرا سا یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ ہم نے جھوٹ کا ارتکاب کیا ہے۔ تجارت میں، صنعت میں، کاروبار میں جھوٹے سرٹیفکیٹ، جھوٹے بیانات، جھوٹی گواہیاں ہورہی ہیں، یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ اب کہنے والے یہ کہتے ہیں

"اس دنیا میں سچ کے ساتھ گزارہ نہیں ہوسکتا"۔ العیاذ باللہ العلی العظیم، یعنی سچ بولنے والا زندہ نہیں رہ سکتا، اور جب تک جھوٹ نہیں بولے گا اس وقت تک کام نہیں چلے گا۔ حالانکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ:

﴿الصدق ینجی والکذب یھلک﴾

"سچائی نجات دینے والی چیز ہے، اور جھوٹ ہلاکت میں ڈالنے والا ہے، برباد کرنے والا ہے"۔

بظاہر وقتی طور پر جھوٹ بولنے سے کوئی نفع حاصل ہوجائے، لیکن انجام کار جھوٹ میں فلاح اور کامیابی نہیں، سچائی میں فلاح ہے، اللہ کا حکم ماننے میں فلاح ہے۔

اس لئے سچائی کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اور پھر اس بارے میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہر ایک جانتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں آجکل جھوٹ کی ہزاروں قسمیں نکل آئی ہیں، یہ جھوٹے سرٹیفکیٹ، جھوٹے بیانات وغیرہ، یہ جھوٹ کی بدترین قسم ہے، اس میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ بہرحال، اس حدیث میں ایک بات تو یہ بیان فرمائی کہ بندے کے مکمل مؤمن ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے۔

بحث ومباحثہ سے پرہیز کریں

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ حق پر ہونے کے باوجود بحث ومباحثہ سے پرہیز کرے۔ ہماری زبان کی آفتوں میں سے ایک بڑی آفت "بحث ومباحثہ" بھی ہے، لوگوں کو اس کا بڑا ذوق ہے، جہاں چند افراد کی مجلس جمی اور کوئی موضوع نکلا، بس پھر اس موضوع پر بحث ومباحثہ شروع ہوگیا۔ وہ مباحثہ بھی ایسی فضول باتوں کا جن کا نہ تو دنیا میں کوئی فائدہ ہے اور نہ آخرت میں کوئی فائدہ۔ یاد رکھئے! یہ بحث ومباحثہ

ایسی چیز ہے جو انسان کے باطن کو تباہ کردیتا ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

﴿المراء یذھب بنور العلم﴾

"بحث ومباحثہ علم کے نور کو تباہ کردیتا ہے"۔

اور بحث ومباحثہ کی عادت عالموں میں زیادہ ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر عالم یہ سمجھتا ہے کہ میں زیادہ جانتا ہوں، اگر دوسرے نے کوئی بات کہدی تو اس سے بحث مباحثہ کرنے کو تیار، اور اس مباحثہ میں گھنٹوں خرچ ہورہے ہیں، چاہے وہ مباحثہ زبانی ہو یا تحریری ہو۔ بس اسی میں وقت صرف ہو رہا ہے۔

اپنی رائے بیان کرکے علیحدہ ہوجائیں

سیدھی سی بات یہ ہے کہ اگر تمہاری رائے دوسرے کی رائے سے مختلف ہے تو تم اپنی رائے بیان کردو کہ میری رائے یہ ہے اور دوسرے کی بات سن لو، اگر سمجھ میں آتی ہے تو قبول کرلو اور اگر سمجھ میں نہیں آتی تو بس یہ کہدو کہ تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی، تمہاری سمجھ میں جو آرہا ہے تم اس پر عمل کرلو اور میری سمجھ میں جو آرہا ہے میں اس پر عمل کروں گا۔ بحث کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اس لئے کہ بحث ومباحثہ میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں دوسرے پر غالب آجاؤں، میری بات اونچی رہے، اور دوسرے کو زیر کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس کے نتیجے میں پھر حق وباطل میں امتیاز باقی نہیں رہتا، بلکہ یہ فکر سوار ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ہو بس دوسرے کو زیر کرنا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یہ فرمادیا کہ اگر تم حق پر ہو اور صحیح بات کہہ رہے ہو اور دوسرا شخص غلط بات کہہ رہا ہے، پھر بھی بحث ومباحثہ مت کرو، بس اپنا صحیح موقف بیان کردو اور اس سے کہہ دو کہ تمہاری سمجھ میں آئے تو قبول کرلو، اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو تم جانو، تمہارا کام جانے۔ تو اس حدیث میں حق بات پر بھی بحث ومباحثہ سے ممانعت فرمادی۔

سورۃ کافرون کے نزول کا مقصد

سورۃ "قل یا یھا الکافرون" جس کو ہم اور آپ نماز میں پڑھتے ہیں، یہ اسی مقصد کو بتانے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا توحید کا پیغام کفار مکہ کے سامنے وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا، اس کے دلائل بیان فرمادئے، لیکن بیان کرنے کے بعد جب بحث ومباحثہ کی نوبت آگئی، تو اس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی:

﴿قل یا ایھا الکفرون ○ لااعبد ماتعبدون ○ ولاانتم عبدون مااعبد ○ ولا انا عابد ماعبدتم ○ ولا انتم عبدون ما اعبد ○ لکم دینکم ولی دین ○﴾ (سورۃ کافرون)

آپ فرمادیجئے اے کافرو! تم جس کی عبادت کرتے ہو، میں اس کی عبادت نہیں کرتا، اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں، اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو، اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارا دین تمہارے ساتھ اور میرا دین میرے ساتھ"۔

مطلب یہ ہے کہ میں بحث ومباحثہ کرنا نہیں چاہتا، جو حق کے دلائل تھے وہ واضح کر کے بتادئے، سمجھا دئے، اگر قبول کرنا ہو تو اپنی فلاح اور کامیابی کی خاطر قبول کرلو، آگے فضول بحث ومباحثہ میں وقت ضائع کرنا نہ تمہارے حق میں مفید ہے اور نہ میرے حق میں مفید ہے، لکم دینکم ولی دین تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین۔

دوسرے کی بات قبول کرلو ورنہ چھوڑ دو

دیکھئے، خالص کفر اور اسلام کے معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ یہ کہہ دو کہ میں جھگڑا نہیں کرتا اور بحث و مباحثہ میں نہیں پڑتا۔ جب کفر اور اسلام کے معاملے میں یہ حکم ہے تو اور دوسرے مسائل میں اس سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے، لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہر وقت ہمارے درمیان بحث و مباحثہ کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، یہ باطن کو خراب کرنے والی چیز ہے۔ اگر کسی سے کسی مسئلے پر کوئی بات کرنی ہو تو طلب حق کے ساتھ بات کرو، اور حق پہنچانے کے لئے بات کرو، اپنا موقف بیان کرو، دوسرے کا موقف سن لو، سمجھ میں آئے تو قبول کرلو، سمجھ میں نہ آئے تو چھوڑ دو، بس، لیکن بحث نہ کرو۔

ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہو جائے گا

میرے پاس بے شمار لوگ خطوط کے اندر لکھتے رہتے ہیں کہ فلاں صاحب سے اس مسئلے میں بحث ہوئی، وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں، ہم ان کا کیا جواب دیں؟ — اب بتایئے، اگر یہ سلسلہ آگے اسی طرح جاری رہے کہ وہ ایک دلیل پیش کریں اور آپ مجھ سے پوچھ لیں کہ اس کا کیا جواب دیں؟ میں اس کا جواب بتادوں، پھر وہ کوئی دوسری دلیل پیش کریں تو پھر تم مجھ سے پوچھو گے کہ اس دلیل کا کیا جواب دیں، تو اس طرح ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہو جائے گا۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ بحث و مباحثہ ہی مت کرو، بلکہ اپنا مسلک بیان کردو کہ میرے نزدیک یہ حق ہے، میں اس پر کاربند ہوں، سامنے والا قبول کرلے تو ٹھیک، نہیں قبول کرتا تو اس سے یہ کہہ دو کہ تم جانو تمہارا کام جانے، میں جس راستے پر ہوں، اسی راستہ پر قائم رہوں گا۔ اس سے زیادہ آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تو یہی ہے کہ اگر تم سچے اور حق پر ہو، پھر بھی بحث و مباحثہ میں مت پڑو۔

مناظرہ مفید نہیں

آج کل "مناظرہ" کرنا اور اس مناظرے میں دوسرے کو شکست دینا ایک ہنر بن گیا ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جب نئے نئے دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تو اس وقت حضرت والا کو باطل فرقوں سے مناظرہ کرنے کا بہت شوق تھا، چنانچہ فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک مناظروں کا یہ سلسلہ جاری رکھا، اور جب بھی کسی سے مناظرہ کرتے تو دوسرے کو زیر ہی کردیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قوت بیان خوب عطا فرمائی تھی۔ لیکن حضرت خود فرماتے ہیں کہ کچھ دن کے بعد اس مناظرہ کے کام سے ایسا دل ہٹا کہ اب میں کسی طرح بھی کسی سے مناظرہ کرنے کو تیار نہیں۔ فرمایا کہ جب میں مناظرہ کرتا تھا تو دل میں ایک ظلمت محسوس ہوتی تھی، پھر بعد میں ساری عمر کبھی مناظرہ نہیں کیا، بلکہ دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ یہ کچھ فائدہ مند نہیں ہے، کہیں واقعی ضرورت پیش آجائے اور حق کی وضاحت مقصود ہو تو اور بات ہے، ورنہ اس کو اپنا مشغلہ بنانا اچھی بات نہیں۔ جب علماء کرام کے لئے یہ اچھی بات نہیں تو عام آدمی کے لئے دین کے مسائل پر بحث کرنا فضول بات ہے۔

فالتو عقل والے بحث و مباحثہ کرتے ہیں

اکبر الہ آبادی مرحوم جو اردو کے مشہور شاعر ہیں، انہوں نے اس بحث و مباحثہ کے بارے میں بڑا اچھا شعر کہا ہے، وہ یہ کہ:

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یعنی مذہبی بحث وہ کرے جس میں فالتو عقل ہو — ہر آدمی کو اس پر عمل کرنا چاہئے — البتہ اگر کوئی مسئلہ معلوم نہیں تو کسی جاننے والے سے پوچھ لو، کوئی

بات سمجھ نہیں آرہی ہے تو پوچھ لو، طالب حق بن کر معلوم کرلو، لیکن بحث ومباحثہ میں کچھ نہیں رکھا۔

بحث ومباحثہ سے ظلمت پیدا ہوتی ہے

اس حدیث کی تشریح میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

> "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحث ومباحثہ سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، کیونکہ ایمان کا کامل نہ ہونا ظلمت ہے، اور اسی لئے تم اہل طریقت کو دیکھو گے کہ وہ بحث ومباحثہ سے سخت نفرت کرتے ہیں"۔

یعنی تصوف اور سلوک کے راستے پر چلنے والے، اولیاء اللہ بحث ومباحثہ سے سخت نفرت کرتے ہیں۔

جناب مودودی صاحب سے مباحثہ کا ایک واقعہ

ہمارے ایک بزرگ تھے حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے، اور بڑے عجیب بزرگ تھے، ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ:

> "جناب مودودی صاحب نے اپنی کتاب "خلافت وملوکیت" میں بعض صحابہ کرام پر بڑے غلط انداز میں گفتگو کی ہے، تم اس کے اوپر کچھ لکھو"۔

چنانچہ میں نے اس پر مضمون لکھ دیا، اس مضمون پر پھر مودودی صاحب کی طرف سے جواب آیا، اس پر پھر میں نے ایک مضمون بطور جواب کے لکھ دیا۔ اس طرح دو مرتبہ جواب لکھا۔ جب حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرا

دوسرا جواب پڑھا، تو مجھے ایک پرچہ لکھا، وہ پرچہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے، اس میں یہ لکھا کہ:

"میں نے تمہارا یہ مضمون پڑھا، اور پڑھ کر بڑا دل خوش ہوا اور دعائیں نکلیں، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے"۔

پھر لکھا کہ:

"اب اس مردہ بحثا بحثی کو دفنا دیجئے"۔

یعنی اب یہ آخری مرتبہ لکھ دیا، اور جو حق واضح کرنا تھا وہ کردیا، اب اس کے بعد اگر وہاں سے کوئی جواب بھی آئے تب بھی تم اس کے جواب میں کچھ مت لکھنا، اس لئے کہ پھر تو بحث و مباحثہ کا دروازہ کھل جائے گا۔ بہرحال، یہ اولیاء اللہ اس بحث و مباحثہ سے سخت نفرت کرتے ہیں، کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، آج تک آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ کسی مناظرے کے نتیجے میں حق قبول کرنے کی توفیق ہوئی ہو۔ سوائے وقت ضائع کرنے کے کچھ حاصل نہیں۔

یہ اہل اللہ بحث و مباحثہ سے نفرت کیوں نہ کریں جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ "مؤمن کی علامت یہ ہے کہ وہ بحث و مباحثہ میں نہیں پڑتا"۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بحث و مباحثہ اور جھوٹ سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دین سیکھنے سکھانے کا طریقہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی
وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب
اصلاحی خطبات : جلد نمبر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دین سیکھنے اور سکھانے کا طریقہ

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینه ونستغفرہ ونؤمن به ونتوکل علیه، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات أعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضلّ له ومن یضلله فلا ھادی له، ونشھد أن لا اله إلا اللّٰہ وحدہ لا شریک لهٗ ونشھد أن سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولهٗ، صلی اللّٰہ تعالٰی عیه وعلٰی اٰله وأصحابه وبارک وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیراً۔

اما بعد!

﴿عن ابی قلابة قال حدثنا مالک رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال اتینا النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ونحن شببة متقاربون فاقمنا عندہ عشرین یومًا ولیلةً وکان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم رحیمًا رفیقًا، فلما ظن انّا قد اشتھینا اھلنا، سألنا عمن ترکنا بعدنا فاخبرناہ فقال ارجعوا إلی اھلیکم فاقیموا فیھم وعلموھم ومروھم وصلوا کما رأیتمونی اصلی، فاذا حضرت الصلوة فلیؤذن لکم احدکم ولیؤمکم اکبرکم﴾

(صحیح بخاری۔ کتاب الآذان، باب الآذان للمسافر اذا کانوا جماعة)

ترجمہ حدیث

یہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک صحابی ہیں جو قبیلہ بنو لیث کے ایک فرد تھے۔ ان کا قبیلہ مدینہ منورہ سے کافی دور ایک بستی میں آباد تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی، یہ لوگ مسلمان ہوگئے۔ مسلمان ہونے کے بعد اپنے گاؤں سے سفر کر کے مدینہ منورہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ اپنی حاضری کا واقعہ ایک طویل حدیث میں بیان فرمارہے ہیں کہ ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے، اور ہم لوگ سب نوجوان اور ہم عمر تھے، اور ہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیس دن قیام کیا۔ بیس دن کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ شاید ہمیں اپنے گھر والوں کے پاس جانے کی خواہش پیدا ہورہی ہے۔ چنانچہ آپ نے ہم سے پوچھا کہ تم اپنے گھر میں کس کس کو چھوڑ کر آئے ہو؟ یعنی تمہارے گھر میں کون کون تمہارے رشتہ دار ہیں؟ ہم نے آپ کو بتادیا کہ فلاں فلاں رشتہ دار ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر انسان پر بڑے ہی مہربان اور بڑے ہی نرم خو تھے۔ چنانچہ آپ نے ہم سے فرمایا کہ اب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ، اور جاکر ان کو دین سکھاؤ اور ان کو حکم دو کہ وہ دین پر عمل کریں۔ اور جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، اسی طرح تم بھی نماز پڑھو، اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک آدمی اذان دیا کرے، اور تم میں سے جو عمر میں بڑا ہو وہ امامت کرے۔ یہ ہدایات دے کر پھر آپ نے ہمیں رخصت فرمادیا۔

دین سیکھنے کا طریقہ، صحبت

یہ ایک طویل حدیث ہے۔ اس میں ہمارے لئے ہدایت کے متعدد سبق ہیں۔ سب سے پہلی بات جو حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمائی: وہ یہ تھی کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور ہم نوجوان تھے اور تقریباً بیس دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے۔ درحقیقت دین سیکھنے کا یہی طریقہ تھا، اس زمانے میں نہ کوئی باقاعدہ مدرسہ تھا اور نہ کوئی یونیورسٹی تھی، نہ کوئی کالج تھا اور نہ کتابیں تھیں۔ بس دین سیکھنے کا یہ طریقہ تھا کہ جس کو دین سیکھنا ہوتا وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں آجاتا، اور آکر آپ کو دیکھتا کہ آپ کس طرح زندگی گزار رہے ہیں؟ صبح سے لے کر شام تک

آپ کے کیا معمولات ہیں؟ لوگوں کے ساتھ آپ کا رویہ کیسا ہے؟ آپ گھر میں کس طرح رہتے ہیں؟ باہر والوں کے ساتھ کس طرح رہتے ہیں؟ یہ سب چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو معلوم کرتے اور اسی سے ان کو دین سمجھ میں آتا۔

"صحبت" کا مطلب

اللہ تعالیٰ نے دین سیکھنے کا جو اصل طریقہ مقرر فرمایا ہے، وہ یہی صحبت ہے، اس لئے کہ کتاب اور مدرسہ سے دین سیکھنا تو ان لوگوں کے لئے ہے جو پڑھے لکھے ہوں، اور پھر تنہا کتاب سے پورا دین بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ صرف کتاب پڑھ لینے سے اس کو کوئی علم وہنر نہیں آتا، دنیا کا کوئی علم صرف کتاب کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ علم وہنر سیکھنے کے لئے صحبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ "صحبت" کا مطلب یہ ہے کہ کسی جاننے والے کے پاس کچھ دن رہنا اور اس کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کرنا، اسی کا نام صحبت ہے اور یہی صحبت انسان کو کوئی علم وہنر اور کوئی فن سکھاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی کو ڈاکٹر بننا ہے تو اس کو کسی ڈاکٹر کی صحبت میں رہنا ہوگا۔ اگر کسی کو انجینئر بننا ہے تو اس کو کسی انجینئر کی صحبت میں رہنا ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر کسی کو کھانا پکانا سیکھنا ہے تو اس کو بھی کچھ وقت باورچی کی صحبت میں گزارنا ہوگا اور اس سے سیکھنا پڑے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دین کا معاملہ رکھا ہے کہ یہ دین صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

صحابہؓ نے کس طرح دین سیکھا؟

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جب کبھی کوئی آسمانی کتاب دنیا میں بھیجی تو اس کے ساتھ ایک رسول ضرور بھیجا، ورنہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو براہِ راست کتاب نازل فرمادیتے، لیکن براہِ راست کتاب نازل کرنے کے بجائے ہمیشہ کسی رسول اور پیغمبر کے ذریعہ کتاب بھیجی، تاکہ وہ رسول اور پیغمبر اس کتاب پر عمل کرنے کا طریقہ

لوگوں کو بتائے، اور اس رسول کی صحبت اور اس کی زندگی کے طرز عمل سے لوگ یہ سیکھیں کہ اس کتاب پر کس طرح عمل کیا جاتا ہے۔ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے پوچھئے کہ انہوں نے کس یونیورسٹی میں تعلیم پائی؟ وہ حضرات کون سے مدرسے سے فارغ التحصیل تھے؟ انہوں نے کون سی کتابیں پڑھی تھیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ ان کے لئے نہ تو ظاہری طور پر کوئی مدرسہ تھا، نہ ہی ان کے لئے کوئی کورس مقرر تھا، نہ کوئی نصابِ تعلیم تھا، نہ کتابیں تھیں۔ لیکن ایک صحابی کے طرز عمل پر ہزار مدرسے اور ہزار کتابیں قربان ہیں، اس لئے کہ اس صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی اور صحبت کے نتیجے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کو دیکھا، اور پھر اس ادا کو اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کی اور اس طرح وہ صحابی بن گئے۔

اچھی صحبت اختیار کرو

بہرحال، یہ صحبت ایسی چیز ہے جو انسان کو کیمیا بناتی ہے۔ اسی لئے ہمارے تمام بزرگوں کا کہنا یہ ہے کہ اگر دین سیکھنا ہے تو پھر اپنی صحبت درست کرو، اور ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھو بیٹھو اور ایسے لوگوں کے پاس جاؤ جو دین کے حامل ہیں، وہ صحبت رفتہ رفتہ تمہارے اندر بھی دین کی عظمت و محبّت اور اس کی فکر پیدا کرے گی، اور اگر غلط صحبت میں بیٹھوگے تو پھر غلط صحبت کے اثرات تم پر ظاہر ہونگے۔ اور یہ دین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے اسی طرح چلا آرہا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے صحابہ کرام تیار ہوئے، اور صحابہ کرام کی صحبت سے تابعین تیار ہوئے، اور تابعین کی صحبت سے تبع تابعین تیار ہوئے، یہ سارے دین کا سلسلہ اس وقت سے لے کر آج تک اسی طرح چلا آرہا ہے۔

دو سلسلے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ معارف

القرآن میں لکھتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے دو سلسلے جاری فرمائے ہیں: ایک کتاب اللہ کا سلسلہ، اور دوسرا رجال اللہ کا سلسلہ۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے اللہ کے آدمی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسے رجال پیدا فرمائے ہیں جو اس کتاب پر عمل کا نمونہ ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص دونوں سلسلوں کو لے کر چلے تو اس وقت دین کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اگر صرف کتاب لے کر بیٹھ جائے اور رجال اللہ سے غافل ہوجائے تو بھی گمراہی میں مبتلا ہوسکتا ہے، اور اگر تنہا رجال اللہ کی طرف دیکھے اور کتاب اللہ سے غافل ہوجائے تو بھی گمراہی میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ لہٰذا دونوں چیزوں کو ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت ہے۔

اسی لئے ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ اس وقت دین کو حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے، اور ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ کے دین کی سمجھ رکھتے ہیں اور دین پر عمل پیرا ہیں، جو شخص جتنی صحبت اختیار کرے گا وہ اتنا ہی دین کے اندر ترقی کرے گا۔ بہرحال، یہ حضرات صحابہ کرام چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رہتے تھے، اس لئے یہ حضرات بیس دن نکال کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے اور ان بیس دنوں میں دین کی جو بنیادی تعلیمات تھیں وہ حاصل کرلیں، دین کا طریقہ سیکھ لیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب ہوگئے۔

اپنے چھوٹوں کا خیال

پھر خود ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ نوجوان لوگ ہیں، یہ اپنے گھر بار چھوڑ کر آئے ہیں، اس لئے ان کو اپنے گھروالوں کی یاد آتی ہوگی اور ان کو اپنے گھروالوں سے ملنے کی خواہش ہوگی، تو خود ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم اپنے گھر میں کس کس کو چھوڑ کر آئے ہو؟ ان میں سے کچھ ایسے نوجوان تھے جو نئے شادی شدہ تھے۔ جب انہوں نے بتایا کہ ہم فلاں فلاں کو چھوڑ کر آئے ہیں تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اب تم اپنے گھروں کو

واپس جاؤ۔

گھر سے دور رہنے کا اصول

اس حدیث کے تحت علماء کرام نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ جو آدمی شادی شدہ ہو، اس کو کسی شدید ضرورت کے بغیر اپنے گھر سے زیادہ عرصہ تک دور نہ رہنا چاہئے، اس میں خود اس کی اپنی بھی حفاظت ہے اور گھر والوں کی بھی حفاظت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین عطا فرمایا ہے جس میں تمام جہتوں اور تمام جانبوں کی رعایت ہے، یہ نہیں کہ ایک طرف کو جھکاؤ ہو گیا اور دوسرے پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، بلکہ اس دین اسلام کے اندر اعتدال ہے، اور اسی لئے اس کو "اُمَّةً وَسَطًا" (درمیانی اُمت) سے تعبیر فرمایا۔ لہٰذا ایک طرف تو یہ فرمادیا کہ دین سیکھنے کے لئے اچھی صحبت اٹھاؤ، لیکن دوسری طرف یہ بتادیا کہ ایسا نہ ہو کہ اچھی صحبت اٹھانے کے نتیجے میں دوسروں کے جو حقوق تمہارے ذمے ہیں وہ پامال ہونے لگیں، بلکہ دونوں باتوں کی رعایت کرنی چاہئے۔ چنانچہ ان حضرات سے فرمایا کہ بیس دن تک یہاں قیام کرلیا اور ضروری باتیں تم نے ان ایام کے اندر سیکھ لیں، اب تمہارے ذمے تمہارے گھر والوں کے حقوق ہیں اور خود تمہارے اپنے حقوق ہیں، اس لئے تم اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔

دوسرے حقوق کی ادائیگی کی طرف توجّہ

اب آپ غور کریں کہ انہوں نے بیس دن میں دین کی تمام تفصیلات تو حاصل نہیں کرلی ہونگی اور نہ ہی دین کا سارا علم سیکھا ہوگا، اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ان سے فرمادیتے کہ ابھی اور قربانی دو اور مزید کچھ دن یہاں رہو تاکہ تمہیں دین کی ساری تفصیلات معلوم ہوجائیں۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ انہوں نے دین کی ضروری باتیں سیکھ لی ہیں، اب ان کو دوسرے حقوق کی ادائیگی کے لئے بھیجنا چاہئے۔

اتنا علم سیکھنا فرض عین ہے

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ دین کے علم کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ دین کا اتنا علم سیکھنا جو انسان کو اپنے فرائض اور واجبات ادا کرنے کے لئے ضروری ہے، مثلاً یہ کہ نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟ نمازوں میں رکعتوں کی تعداد کتنی ہے؟ نماز میں کتنے فرائض اور واجبات ہیں؟ روزہ کیسے رکھا جاتا ہے اور کس وقت فرض ہوتا ہے؟ زکوٰۃ کب فرض ہوتی ہے اور کتنی مقدار میں کن افراد کو ادا کی جاتی ہے؟ اور حج کب فرض ہوتا ہے؟ اور یہ کہ کون سی چیز حلال ہے اور کون سی چیز حرام ہے؟ مثلاً جھوٹ بولنا حرام ہے، غیبت کرنا حرام ہے، شراب پینا حرام ہے، خنزیر کھانا حرام ہے، یہ حلال و حرام کی بنیادی موٹی موٹی باتیں سیکھنا۔ لہٰذا اتنی معلومات حاصل کرنا جس کے ذریعہ انسان اپنے فرائض و واجبات ادا کر سکے اور حرام سے اپنے آپ کو بچا سکے، ہر مسلمان مرد و عورت کے ذمے فرض عین ہے۔ یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ "طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة" یعنی علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد و عورت کے ذمے فرض ہے۔ اس سے مراد یہی علم ہے۔

اتنا علم حاصل کرنے کے لئے جتنی بھی قربانی دینی پڑے، قربانی دے۔ مثلاً والدین کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑے۔ بیوی کو اور بہن بھائیوں کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑے، اس لئے کہ اتنا علم حاصل کرنا فرض ہے، اگر کوئی یہ علم حاصل کرنے سے روکے، مثلاً ماں باپ روکیں، بیوی روکے، یا بیوی کو شوہر روکے تو ان کی بات ماننا جائز نہیں۔

یہ علم فرض کفایہ ہے

علم کی دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی علم دین کی باقاعدہ پوری تفصیلات حاصل کرے اور باقاعدہ عالم بنے۔ یہ ہر انسان کے ذمے فرض عین نہیں ہے بلکہ یہ علم

فرض کفایہ ہے۔ اگر کچھ لوگ عالم بن جائیں تو باقی لوگوں کا فریضہ بھی ادا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک بستی میں ایک عالم ہے اور دین کی تمام ضروریات کے لئے کافی ہے، تو ایک آدمی کے عالم بن جانے سے باقی لوگوں کا فریضہ بھی ساقط ہو جائے گا، اور اگر کوئی بڑی بستی ہو یا شہر ہو تو اس کے لئے جتنے علماء کی ضرورت ہو، اس ضرورت کے مطابق اتنے لوگ عالم بن جائیں تو باقی لوگوں کا فریضہ ساقط ہو جائے گا۔

دین کی باتیں گھر والوں کو سکھاؤ

بہرحال، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس کیا کہ ان حضرات نے فرض عین کے بقدر جو علم تھا وہ بیس دن میں حاصل کر لیا ہے، اور اب ان کو مزید یہاں روکنے میں یہ اندیشہ ہے کہ ان کے گھر والوں کی حق تلفی نہ ہو، لہٰذا آپ نے ان حضرات سے فرمایا کہ اب اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ لیکن ساتھ یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ یہ نہ ہو کہ گھر والوں کے پاس جاکر غفلت کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کر دو، بلکہ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے یہاں رہ کر علم حاصل کیا اور جو کچھ دین کی باتیں یہاں سیکھیں، وہ باتیں اپنے گھر والوں کو جاکر سکھاؤ۔ اس سے پتہ چلا کہ ہر انسان کے ذمے یہ بھی فرض ہے کہ وہ جس طرح خود دین کی باتیں سیکھتا ہے، اپنے گھر والوں کو بھی سکھائے۔ ان کو اتنی دین کی باتیں سکھانا جن کے ذریعہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان بن سکیں اور مسلمان رہ سکیں، یہ تعلیم دینا بھی ہر مسلمان کے ذمے فرض عین ہے۔ اور یہ ایسا ہی فرض ہے جیسے نماز پڑھنا فرض ہے، جیسے رمضان میں روزے رکھنا فرض ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنا اور حج ادا کرنا فرض ہے۔ یہ کام جتنے ضروری ہیں، اتنا ہی گھر والوں کو دین سکھانا بھی ضروری ہے۔

اولاد کی طرف سے غفلت

ہمارے معاشرے میں اس بارے میں بڑی کوتاہی پائی جاتی ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے، سمجھدار اور بظاہر دین دار لوگ بھی اپنی اولاد کو دینی تعلیم دینے کی فکر

نہیں کرتے، اولاد کو نہ تو قرآن کریم صحیح طریقے سے پڑھنا آتا ہے، نہ ان کو نمازوں کا صحیح طریقہ آتا ہے اور نہ ہی ان کو دین کی بنیادی معلومات حاصل ہیں۔ دنیاوی تعلیم اعلیٰ درجے کی حاصل کرنے کے باوجود ان کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ فرض سُنّت میں کیا فرق ہوتا ہے۔ لہٰذا اولاد کو دین سکھانے کا اتنا ہی اہتمام کرنا چاہئے جتنا خود نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور آگے آپ نے فرمایا کہ جاکر گھر والوں کو حکم دو، یعنی ان کو دین کی باتوں کا اور فرائض پر عمل کرنے کا حکم دو۔

کس طرح نماز پڑھنی چاہئے

پھر فرمایا: "صَلُّوْا کَمَا رأیتمونی اُصَلِّی" یعنی اپنے وطن جاکر اسی طرح نماز پڑھنا جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ آپ نے ان سے صرف یہ نہیں فرمایا کہ نماز پڑھتے رہنا، بلکہ یہ فرمایا کہ نماز اس طرح پڑھنا جس طرح تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی یہ نماز دین کا ستون ہے، اس لئے اس کو ٹھیک اسی طرح بجالانے کی کوشش کرنی چاہئے جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور منقول ہے۔ یہ مسئلہ بھی ہمارے معاشرے میں بڑی توجہ کا طالب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت سے لوگ نماز پڑھتے تو ہیں، لیکن وہ پڑھنا ایسا ہوتا ہے جیسے سر سے ایک بوجھ اتار دیا، نہ اس کی فکر کہ قیام صحیح ہوا یا نہیں؟ رکوع صحیح ہوا یا نہیں؟ سجدہ صحیح ہوا یا نہیں، اور یہ ارکان سُنّت کے مطابق ادا ہوئے یا نہیں؟ بس جلدی جلدی نماز پڑھ کر فارغ ہوگئے اور سر سے فریضہ اتار دیا۔ حالانکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ صَلُّوا کمارأیتمونی اُصَلِّی یعنی جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو۔

نماز سُنّت کے مطابق پڑھئے

دیکھئے! اگر نماز سُنّت کے مطابق اس طرح پڑھی جائے جس طرح نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو اس میں کوئی زیادہ وقت خرچ نہیں ہوتا، نہ ہی زیادہ محنت لگتی ہے، بلکہ اتنا ہی وقت صرف ہوگا اور اتنی ہی محنت خرچ ہوگی جتنی کہ اس طریقے سے پڑھنے میں لگتی ہے جس طریقے سے ہم پڑھتے ہیں۔ لیکن اگر تھوڑا سے دھیان اور توجہ کرلی جائے کہ جو نماز میں پڑھ رہا ہوں وہ سُنّت کے مطابق ہوجائے، تو اس توجہ کے نتیجے میں وہی نماز سُنّت کے نور سے منوّر ہوجائے گی، اور غفلت سے اپنے طریقے سے پڑھتے رہوگے تو فریضہ تو ادا ہوجائے گا اور نماز چھوڑنے کا گناہ بھی نہ ہوگا، لیکن سُنّت کا جو نور ہے، جو اس کی برکت ہے اور اس کے جو فوائد ہیں وہ حاصل نہ ہونگے۔ ایک مرتبہ میں نے اسی مجلس میں تفصیل سے یہ عرض کیا تھا کہ سُنّت کے مطابق کس طرح نماز پڑھی جاتی ہے، وہ بیان قلم بند ہوکر شائع ہوچکا ہے جس کا نام "نمازیں سُنّت کے مطابق پڑھئے" ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اور عام طور پر لوگ نماز میں جو غلطیاں کرتے ہیں اس میں اس کی نشاندہی کردی ہے۔ آپ اس رسالے کو پڑھیں اور پھر اپنی نماز کا جائزہ لیں، اور یہ دیکھیں کہ جس طریقے سے آپ نماز پڑھتے ہیں اس میں، اور جو طریقہ اس رسالے میں لکھا ہے، اس میں کیا فرق ہے؟ آپ اندازہ لگائیں گے کہ اس رسالے کے مطابق نماز پڑھنے میں کوئی زیادہ وقت خرچ نہیں ہوگا، زیادہ محنت نہیں لگے گی، لیکن سُنّت کا نور حاصل ہوجائے گا۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اس کی فکر کرنی چاہئے۔

حضرت مفتی اعظمؒ کا نماز کی درستی کا خیال

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تراسی (۸۳) سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ بچپن سے دین ہی پڑھنا شروع کیا، ساری عمر دین ہی کی تعلیم دی اور فتوے لکھے، یہاں تک کہ ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم قرار پائے۔ پھر جب پاکستان تشریف لائے تو یہاں پر بھی "مفتی اعظم" کے لقب سے مشہور ہوئے، اور بلامبالغہ لاکھوں فتوؤں کے جواب زبانی اور

تحریری دیئے، اور ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ میری ساری عمر فقہ پڑھنے پڑھانے میں گزری، لیکن اب بھی بعض اوقات نماز پڑھتے ہوئے ایسی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں، چنانچہ نماز پڑھنے کے بعد کتاب دیکھ کر یہ پتہ لگاتا ہوں کہ میری نماز درست ہوئی یا نہیں؟ لیکن میں لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ کسی کے دل میں یہ خیال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نماز درست ہوئی یا نہیں؟ بس پڑھ لی، اور سُنّت کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کا خیال تو بہت دور کی بات ہے۔

نماز فاسد ہوجائے گی

نماز کی صفوں میں روزانہ یہ منظر نظر آتا ہے کہ لوگ آرام سے بالکل بے پرواہ ہو کر نماز میں کھڑے ہوئے سر کھجا رہے ہیں یا دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر رہے ہیں۔ یاد رکھئے! اس طرح اگر دونوں ہاتھ سے کوئی کام کرلیا اور اس حالت میں اتنا وقت گزر گیا جتنی دیر میں تین مرتبہ "سبحان ربی الاعلیٰ" کی تسبیح پڑھی جاسکے تو بس نماز ٹوٹ گئی، فاسد ہوگئی، فریضہ ہی ادا نہ ہوا، لیکن لوگوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ بعض اوقات دونوں ہاتھوں سے کپڑے درست کررہے ہیں یا دونوں ہاتھوں سے پسینہ صاف کررہے ہیں، حالانکہ اس طرح کرنے میں زیادہ وقت لگ جائے تو نماز ہی فاسد ہوجاتی ہے۔ یاد رکھئے! نماز میں ایسی ہیئت اختیار کرنا جس سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ شاید یہ نماز نہیں پڑھ رہا ہے، تو ایسی ہیئت سے نماز فاسد ہوجاتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص نماز میں ایک ہاتھ سے کام کرے، اس کے بارے میں فقہاء کرام نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک رکن میں مسلسل تین مرتبہ ایک ہاتھ سے کوئی کام کرے کہ دیکھنے والا اسے نماز میں نہ سمجھے تو نماز فاسد ہوجائے گی۔ اسی طرح سجدہ کرتے وقت پیشانی تو زمین پر ٹکی ہوئی ہے لیکن دونوں پاؤں زمین سے اٹھے ہوئے ہیں، اگر پورے سجدے میں دونوں پاؤں پورے اٹھے رہے اور ذرا سی دیر کے لئے بھی زمین پر نہ ٹکے تو سجدہ ادا نہ ہوا، اور جب سجدہ ادا نہ ہوا تو نماز بھی

درست نہ ہوئی۔

صرف نیت کی درستی کافی نہیں

یہ چند باتیں مثال کے طور پر عرض کردیں۔ ان کی طرف توجہ اور دھیان نہیں، اور ان کی اصلاح اور درستی کی فکر نہیں، بلکہ ان کی طرف سے غفلت ہے، وقت بھی خرچ کررہے ہیں، نماز بھی پڑھ رہے ہیں، لیکن اس کو صحیح طریقے سے ادا کرنے کی فکر نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کری کرائی محنت اکارت جارہی ہے۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ اگر کسی کو بتایا جائے کہ بھائی! نماز میں ایسی حرکت نہیں کرنی چاہئے، تو ایک ٹکسالی جواب ہر شخص کو یاد ہے، بس وہ جواب دے دیا تا ہے، وہ یہ کہ: انما الاعمال بالنیات۔ یہ ایسا جواب ہے جو ہر جگہ جاکر فٹ ہوجاتا ہے۔ یعنی ہماری نیت تو درست ہے اور اللہ میاں نیت کو دیکھنے والے ہیں۔ ارے بھائی! اگر نیت ہی کافی تھی تو یہ سب تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی، بس گھر میں بیٹھ کر نیت کرلیتے کہ ہم اللہ میاں کی نماز پڑھ رہے ہیں، بس نماز ادا ہوجاتی۔ ارے بھائی! نیت کے مطابق عمل بھی تو چاہئے، مثلاً آپ نے یہ نیت تو کرلی کہ میں لاہور جارہا ہوں اور کوئٹہ والی گاڑی میں بیٹھ گئے، تو کیا خالی یہ نیت کرنے سے کہ میں لاہور جارہا ہوں۔ کیا تم لاہور پہنچ جاؤ گے؟ اسی طرح اگر نیت کرلی کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں، لیکن نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا، تو تنہا نیت کرنے سے نماز کس طرح درست ہوگی؟ جب تک وہ طریقہ اختیار نہ کیا ہو جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ اسی لئے آپ نے ان نوجوانوں کو رخصت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سُنّت کے مطابق نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اذان کی اہمیت

پھر آپ نے ان سے فرمایا: فاذا حضرت الصلٰوۃ فلیؤذن لکم أحدکم

یعنی جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے۔ یہ اذان دینا مسنون ہے۔ اگر بالفرض کوئی شخص مسجد میں نماز نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ جنگل یا صحراء میں نماز پڑھ رہا ہے، تو اس وقت بھی سُنّت یہ ہے کہ اذان دے۔ یہاں تک کہ اگر آدمی اکیلا ہے تب بھی حکم یہ ہے کہ اذان دے کر نماز پڑھے۔ کیونکہ اذان اللہ کے دین کا ایک شعار اور علامت ہے، اس لئے ہر نماز کے وقت اذان کا حکم ہے۔ بعض علماء کرام سے سوال کیا گیا کہ جنگل اور صحراء میں اذان دینے سے کیا فائدہ ہے؟ جب کہ کسی اور انسان کے سننے اور سُن کر نماز کے لئے آنے کی کوئی امید نہیں ہے، یا مثلاً غیر مسلموں کا علاقہ ہے تو پھر اذان دینے سے کیا فائدہ؟ اس لئے کہ اذان کی آواز سُن کر کون نماز کے لئے آئے گا؟ تو علماء کرام نے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق بیشمار ہیں، ہو سکتا ہے کہ انسان اس اذان کی آواز کو نہ سنیں لیکن ہو سکتا ہے کہ جنّات اذان کی آواز سن کر آجائیں یا ملائکہ آجائیں اور وہ تمہاری نماز میں شریک ہو جائیں۔ بہرحال، حکم یہ ہے کہ نماز سے پہلے اذان دو، چاہے تم تنہا ہی ہو۔

بڑے کو امام بنائیں

پھر آپ نے ان سے فرمایا کہ "ولیؤمکم اکبرکم" یعنی تم میں سے جو شخص عمر میں بڑا ہو وہ امامت کرے۔ اصل حکم یہ ہے کہ اگر جماعت کے وقت بہت سے لوگ موجود ہیں تو ان میں جو شخص علم میں زیادہ ہو، اس کو امامت کے لئے آگے کرنا چاہئے۔ لیکن یہاں پر چونکہ علم کے اعتبار سے یہ حضرات برابر تھے، سب اکٹھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تھے، جو علم ایک نے سیکھا، وہی علم دوسرے نے بھی سیکھا، اور حکم یہ ہے کہ جب علم میں سب برابر ہوں تو پھر جو شخص عمر میں بڑا ہو، اس کو آگے کرنا چاہئے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے بڑے آدمی کا ایک اعزاز رکھا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے عمر میں بڑا بنایا ہے، چھوٹوں کو چاہئے کہ اس کو اپنا بڑا مانیں اور بڑا مان کر اس کو آگے کریں۔

بڑے کو بڑائی دینا اسلامی ادب ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خیبر جو یہودیوں کی بستی تھی، وہاں پر ایک مسلمان کو یہودیوں نے قتل کردیا تھا، جن صاحب کو قتل کیا گیا تھا ان کے ایک بھائی تھے جو اس مقتول کے ولی تھے، وارث تھے، وہ بھائی اپنے چچا کو لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ بتانے کے لئے آئے کہ ہمارا بھائی قتل کردیا گیا، اب اس کا بدلہ لینے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے۔ چونکہ یہ جو بھائی تھے، یہ رشتہ کے اعتبار سے مقتول کے زیادہ قریبی تھے، اور دوسرے چچا تھے۔ یہ دونوں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور مقتول کے بھائی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرنی شروع کردی، اور چچا خاموش بیٹھے تھے، تو اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے بھائی سے فرمایا کہ "کَبِّرِ الکُبْرَ" بڑے کو بڑائی دو۔ یعنی جب ایک بڑا تمہارے ساتھ موجود ہے تو پھر تمہیں گفتگو کا آغاز نہ کرنا چاہئے، بلکہ تمہیں اپنے چچا کو کہنا چاہئے کہ گفتگو کا آغاز وہ کریں، پھر جب ضرورت ہو تو تم بھی درمیان میں گفتگو کرلینا، لیکن بڑے کو بڑائی دو۔ یہ بھی اسلامی آداب کا ایک تقاضہ ہے کہ جو عمر میں بڑا ہو، اس کو آگے کیا جائے۔ اگرچہ اس کو دوسری کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، صرف بڑی عمر ہونے کی فضیلت حاصل ہے، تو اس کا بھی ادب اور لحاظ کیا جائے اور اس کو آگے رکھا جائے، نہ کہ چھوٹا آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ اسی لئے آپ نے ان نوجوانوں سے فرمایا کہ جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں جو عمر میں بڑا ہو، اس کو امام بنادو۔ اس لئے کہ امامت کا منصب ایسے آدمی کو دینا چاہئے جو سب میں علم کے اعتبار سے فائق ہو یا کم از کم عمر کے اعتبار سے فائق ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دَعْوانا اَنِ الحَمْدُ للّٰہِ رَبِّ العٰلمین

استخارہ کا مسنون طریقہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

استخارہ کا مسنون طریقہ

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیٔات اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھدان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ، صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرًاکثیرا۔

امابعد!

﴿عن مکحول الازدی رحمہ اللّٰہ تعالٰی قال: سمعت ابن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ یقول: ان الرجل یستخیر اللّٰہ تبارک و تعالٰی فیختارلہ، فیسخط علی ربہ عزوجل، فلایلبث ان ینظر فی العاقبۃ فاذا ھو خیر لہ﴾ (کتاب الزہدلابن مبارک، زیادات الزھد لنعیم بن حماد، باب فی الرضا بالقضاء صفحہ ۳۲)

حدیث کا مطلب

یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ایک ارشاد ہے۔ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات انسان اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہے کہ جس کام میں میرے لئے خیر ہو وہ کام ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے وہ کام اختیار فرمادیتے ہیں جو اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، لیکن ظاہری اعتبار سے وہ کام اس بندہ کی سمجھ میں نہیں آتا تو وہ بندہ اپنے پروردگار پر ناراض ہوتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے تو یہ کہا تھا کہ میرے لئے اچھا کام تلاش کیجئے، لیکن جو کام ملا وہ تو مجھے اچھا نظر نہیں آرہا ہے، اس میں تو میرے لئے تکلیف اور پریشانی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب انجام سامنے آتا ہے تب اس کو پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جو فیصلہ کیا تھا وہی میرے حق میں بہتر تھا۔ اس وقت اس کو پتہ نہیں تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ میرے ساتھ زیادتی اور ظلم ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا صحیح ہونا بعض اوقات دنیا میں ظاہر ہوجاتا ہے اور بعض اوقات آخرت میں ظاہر ہوگا۔

اس روایت میں چند باتیں قابل ذکر ہیں، ان کو سمجھ لینا چاہئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے خیر کا فیصلہ فرمادیتے ہیں۔ استخارہ کسے کہتے ہیں؟ اس بارے میں لوگوں کے درمیان طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "استخارہ" کرنے کا کوئی خاص طریقہ اور خاص عمل ہوتا ہے، اس کے بعد کوئی خواب نظر آتا ہے اور اس خواب کے اندر ہدایت دی جاتی ہے کہ فلاں کام کرو یا نہ کرو۔ خوب سمجھ لیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے "استخارہ" کا جو مسنون طریقہ ثابت ہے اس میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں۔

استخارہ کا طریقہ اور اس کی دعا

"استخارہ" کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آدمی دو رکعت نفل استخارہ کی نیت سے پڑھے۔ نیت یہ کرے کہ میرے سامنے دو راستے ہیں، ان میں سے جو راستہ میرے حق میں بہتر ہو، اللہ تعالیٰ اس کا فیصلہ فرمادیں۔ پھر دو رکعت پڑھے اور نماز کے بعد استخارہ کی وہ مسنون دعا پڑھے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے۔ یہ بڑی عجیب دعا ہے، پیغمبر ہی یہ دعا مانگ سکتا ہے اور کسی کے بس کی بات نہیں، اگر انسان ایڑی چوٹی کا زور لگالیتا تو بھی ایسی دعا کبھی نہ کر سکتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی۔ وہ دعا یہ ہے۔

﴿اللّٰهم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسئلک من فضلک العظیم، فانّک تقدر ولا اقدر، وتعلم ولا اعلم، وانت علّام الغیوب، اللّٰهم ان کنت تعلم ان هذا الامر خیر لی فی دینی ومعیشتی وعاقبة امری او قال فی عاجل امری وآجله فیسّره لی ثم بارک لی فیه، وان کنت تعلم ان هذا الامر شر لی فی دینی ومعیشتی وعاقبة امری او قال فی عاجل امری وآجله فاصرفه عنی واصرفنی عنه واقدر لی الخیر حیث کان ثم ارضنی به﴾

(ترمذی کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی صلاۃ الاستخارۃ)

دعا کا ترجمہ

اے اللہ! میں آپ کے علم کا واسطہ دے کر آپ سے خیر طلب کرتا ہوں اور آپ کی قدرت کا واسطہ دے کر میں اچھائی پر قدرت طلب کرتا ہوں، آپ غیب کو

جاننے والے ہیں۔ اے اللہ! آپ علم رکھتے ہیں، میں علم نہیں رکھتا۔ یعنی یہ معاملہ میرے حق میں بہتر ہے یا نہیں، اس کا علم آپ کو ہے مجھے نہیں۔ اور آپ قدرت رکھتے ہیں اور میرے اندر قدرت نہیں۔ یا اللہ! اگر آپ کے علم میں ہے کہ یہ معاملہ (اس موقع پر اس معاملہ کا تصور دل میں لائے جس کے لئے استخارہ کررہا ہے) میرے حق میں بہتر ہے، میرے دین کے لئے بھی بہتر ہے، میری معاش اور دنیا کے اعتبار سے بھی بہتر ہے اور انجام کار کے اعتبار سے بھی بہتر ہے تو اس کو میرے لئے مقدر فرمادیجئے اور اس کو میرے لئے آسان فرمادیجئے اور اس میں میرے لئے برکت پیدا فرمادیجئے۔ اور اگر آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ یہ معاملہ میرے حق میں بُرا ہے، میرے دین کے حق میں بُرا ہے یا میری دنیا اور معاش کے حق میں بُرا ہے یا میرے انجام کار کے اعتبار سے بُرا ہے تو اس کام کو مجھ سے پھیر دیجئے اور مجھے اس سے پھیر دیجئے، اور میرے لئے خیر مقدر فرمادیجئے جہاں بھی ہو۔ یعنی اگر یہ معاملہ میرے لئے بہتر نہیں ہے تو اس کو تو چھوڑ دیجئے اور اس کے بدلے جو کام میرے لئے بہتر ہو اس کو مقدر فرمادیجئے، پھر مجھے اس پر راضی بھی کردیجئے اور اس پر مطمئن بھی کردیجئے۔

دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرلی تو بس استخارہ ہوگیا۔

استخارہ کا کوئی وقت مقرر نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ ہمیشہ رات کو سوتے وقت ہی کرنا چاہئے یا عشاء کی نماز کے بعد ہی کرنا چاہئے۔ ایسا کوئی ضروری نہیں، بلکہ جب بھی موقع ملے اس وقت یہ استخارہ کرلے۔ نہ رات کی کوئی قید ہے، اور نہ دن کی کوئی قید ہے نہ سونے کی کوئی قید ہے اور نہ جاگنے کی کوئی قید ہے۔

خواب آنا ضروری نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ کرنے کے بعد خواب آئے گا اور خواب کے ذریعہ ہمیں بتایا جائے گا کہ یہ کام کرو یا نہ کرو۔ یاد رکھئے! خواب آنا کوئی ضروری نہیں کہ خواب میں کوئی بات ضرور بتائی جائے یا خواب میں کوئی اشارہ ضرور دیا جائے، بعض مرتبہ خواب میں آجاتا ہے اور بعض مرتبہ خواب میں نہیں آتا۔

استخارہ کا نتیجہ

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ استخارہ کرنے کے بعد خود انسان کے دل کا رجحان ایک طرف ہوجاتا ہے، بس جس طرف رجحان ہوجائے وہ کام کرلے، اور بکثرت ایسا رجحان ہوجاتا ہے۔ لیکن بالفرض اگر کسی ایک طرف دل میں رجحان نہ بھی ہو بلکہ دل میں کشمکش موجود ہو تو بھی استخارہ کا مقصد پھر بھی حاصل ہے، اس لئے کہ بندہ کے استخارہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ وہی کرتے ہیں جو اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوجاتے ہیں پھر وہی ہوتا ہے جس میں بندے کے لئے خیر ہوتی ہے اور اس کو پہلے سے پتا بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات انسان ایک راستے کو بہت اچھا سمجھ رہا ہوتا ہے لیکن اچانک رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کو اس بندے سے پھیر دیتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ استخارہ کے بعد اسباب ایسے پیدا فرمادیتے ہیں کہ پھر وہی ہوتا ہے جس میں بندے کے لئے خیر ہوتی ہے۔ اب خیر کس میں ہے؟ انسان کو پتہ نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمادیتے ہیں۔

تمہارے حق میں یہی بہتر تھا

اب جب وہ کام ہوگیا تو اب ظاہری اعتبار سے بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ جو کام ہوا وہ اچھا نظر نہیں آرہا ہے، دل کے مطابق نہیں ہے، تو اب بندہ اللہ تعالیٰ سے

شکوہ کرتا ہے کہ یا اللہ! میں نے آپ سے مشورہ اور استخارہ کیا تھا مگر کام وہ ہوگیا جو میری مرضی اور طبیعت کے خلاف ہے اور بظاہر یہ کام اچھا معلوم نہیں ہو رہا ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمارہے ہیں کہ ارے نادان! تو اپنی محدود عقل سے سوچ رہا ہے کہ یہ کام تیرے حق میں بہتر نہیں ہوا، لیکن جس کے علم میں ساری کائنات کا نظام ہے، وہ جانتا ہے کہ تیرے حق میں کیا بہتر تھا اور کیا بہتر نہیں تھا، اس نے جو کیا وہی تیرے حق میں بہتر تھا۔ بعض اوقات دنیا میں تجھے پتہ چل جائیگا کہ تیرے حق میں کیا بہتر تھا اور بعض اوقات پوری زندگی میں بھی پتہ نہیں چلے گا، جب آخرت میں پہنچے گا تب وہاں جاکر پتہ چلے گا کہ واقعۃً یہی میرے لئے بہتر تھا۔

تم بچے کی طرح ہو

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے ایک بچہ ہے جو ماں باپ کے سامنے مچل رہا ہے کہ فلاں چیز کھاؤں گا اور ماں باپ جانتے ہیں کہ اس وقت بچے کا یہ چیز کھانا بچے کے لئے نقصان دہ ہے اور مہلک ہے۔ چنانچہ ماں باپ بچے کو وہ چیز نہیں دیتے، اب بچہ اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میرے ماں باپ نے میرے ساتھ ظلم کیا، میں جو چیز مانگ رہا تھا وہ چیز مجھے نہیں دی اور اس کے بدلے میں مجھے کڑوی کڑوی دوا کھلا رہے ہیں۔ اب وہ بچہ اس دوا کو اپنے حق میں خیر نہیں سمجھ رہا ہے لیکن بڑا ہونے کے بعد جب اللہ تعالیٰ اس بچے کو عقل اور فہم عطا فرمائیں گے اور اس کو سمجھ آئے گی تو اس وقت اس کو پتہ چلے گا کہ میں تو اپنے لئے موت مانگ رہا تھا اور میرے ماں باپ میرے لئے زندگی اور صحت کا راستہ تلاش کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر ماں باپ سے زیادہ مہربان ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ وہ راستہ اختیار فرماتے ہیں جو انجام کار بندہ کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ اب بعض اوقات اس کا بہتر ہونا

دنیا میں پتہ چل جاتا ہے اور بعض اوقات دنیا میں پتہ نہیں چلتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ ایک واقعہ سنایا۔ یہ واقعہ میں نے انہیں سے سنا ہے، کہیں کتاب میں نظر سے نہیں گزرا لیکن کتابوں میں کسی جگہ ضرور منقول ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے جارہے تھے تو راستے میں ایک شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ حضرت! آپ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لئے تشریف لے جارہے ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوگا اور اپنی خواہشات، اپنی تمنائیں اور اپنی آرزوئیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کا اس سے زیادہ اچھا موقع اور کیا ہوسکتا ہے، اس لئے جب آپ وہاں پہنچیں تو میرے حق میں بھی دعا کردیجئے گا۔ کیونکہ میری زندگی میں مصیبتیں بہت ہیں اور میرے اوپر تکلیفوں کا ایک پہاڑ ٹوٹا ہوا ہے، فقرو فاقہ کا عالم ہے اور طرح طرح کی پریشانیوں میں گرفتار ہوں۔ میرے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیجئے گا کہ اللہ تعالیٰ مجھے راحت اور عافیت عطا فرمادیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کرلیا کہ اچھی بات ہے، میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔

جاؤ ہم نے اس کو زیادہ دیدی

جب کوہ طور پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہوئے۔ ہم کلامی کے بعد آپ کو وہ شخص یاد آیا جس نے دعا کے لئے کہا تھا۔ آپ نے دعا کی یا اللہ! آپ کا ایک بندہ ہے جو فلاں جگہ رہتا ہے، اس کا یہ نام ہے، اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جب میں آپ کے سامنے حاضر ہوں تو اس کی پریشانی پیش کردوں۔ یا اللہ! وہ بھی آپ کا بندہ ہے،

آپ اپنی رحمت سے اس کو راحت عطا فرمادیجئے تاکہ وہ آرام اور عافیت میں آجائے اور اس کی مصیبتیں دور ہوجائیں اور اس کو بھی اپنی نعمتیں عطا فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے موسیٰ! اس کو تھوڑی نعمت دوں یا زیادہ دوں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں تو تھوڑی کیوں مانگیں۔ اس لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے فرمایا کہ یا اللہ! جب نعمت دینی ہے تو زیادہ ہی دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جاؤ ہم نے اس کو زیادہ دیدی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مطمئن ہوگئے۔ اس کے بعد کوہ طور پر جتنے دن قیام کرنا تھا قیام کیا۔

ساری دنیا بھی تھوڑی ہے

جب کوہ طور سے واپس تشریف لے جانے لگے تو خیال آیا کہ جاکر ذرا اس بندہ کا حال دیکھیں کہ وہ کس حال میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں دعا قبول فرمالی تھی۔ چنانچہ اس کے گھر جاکر دروازے پر دستک دی تو ایک دوسرا شخص باہر نکلا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے فلاں شخص سے ملاقات کرنی ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا تو کافی عرصہ ہوا انتقال ہوچکا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ کب انتقال ہوا؟ اس نے کہا فلاں دن اور فلاں وقت انتقال ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اندازہ لگایا کہ جس وقت میں نے اس کے حق میں دعا کی تھی اس کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کا انتقال ہوا ہے۔ اب موسیٰ علیہ السلام بہت پریشان ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا اللہ! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی، میں نے اس کے لئے عافیت اور راحت مانگی تھی اور نعمت مانگی تھی، مگر آپ نے اس کو زندگی سے ختم کردیا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تم سے پوچھا تھا کہ تھوڑی نعمت دیں یا زیادہ دیں؟ تم نے کہا تھا کہ زیادہ دیں، اگر ہم ساری دنیا بھی اٹھاکر دے دیتے تب بھی تھوڑی ہی ہوتی اور اب ہم نے اس کو آخرت اور جنت کی جو نعمتیں دی ہیں ان پر واقعی یہ بات صادق آتی ہے کہ

وہ زیادہ نعمتیں ہیں، دنیا کے اندر زیادہ نعمتیں اس کو مل ہی نہیں سکتی تھیں، لہٰذا ہم نے اس کو آخرت کی نعمتیں عطا فرمادیں۔

یہ انسان کس طرح اپنی محدود عقل سے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ وہی جانتے ہیں کہ کس بندے کے حق میں کیا بہتر ہے۔ اور انسان صرف ظاہر میں چند چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو بُرا ماننے لگتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا کہ کس کے حق میں کیا بہتر ہے۔

استخارہ کرنے کے بعد مطمئن ہو جاؤ

اسی وجہ سے اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرما رہے ہیں کہ جب تم کسی کام کا استخارہ کر چکو تو اس کے بعد اس پر مطمئن ہو جاؤ کہ اب اللہ تعالیٰ جو بھی فیصلہ فرمائیں گے وہ خیر ہی کا فیصلہ فرمائیں گے، چاہے وہ فیصلہ ظاہر نظر میں تمہیں اچھا نظر نہ آرہا ہو، لیکن انجام کے اعتبار سے وہی بہتر ہو گا۔ اور پھر اس کا بہتر ہونا یا تو دنیا ہی میں معلوم ہو جائے گا ورنہ آخرت میں جاکر تو یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا تھا وہی میرے حق میں بہتر تھا۔

استخارہ کرنے والا ناکام نہیں ہو گا

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

﴿ما خاب من استخار ولا ندم من استشار﴾

(مجمع الزوائد: جلد ۸ صفحہ ۹۶)

یعنی جو آدمی اپنے معاملات میں استخارہ کرتا ہو وہ کبھی ناکام نہیں ہو گا اور جو شخص اپنے کاموں میں مشورہ کرتا ہو وہ کبھی نادم اور پشیمان نہیں ہو گا کہ میں نے یہ

کام کیوں کرلیا یا میں نے یہ کام کیوں نہیں کیا، اس لئے کہ جو کام کیا وہ مشورہ کے بعد کیا اور اگر نہیں کیا تو مشورہ کے بعد نہیں کیا، اس وجہ سے وہ نادم نہیں ہوگا۔ اس حدیث میں یہ جو فرمایا کہ استخارہ کرنے والا ناکام نہیں ہوگا، مطلب اس کا یہی ہے کہ انجام کار استخارہ کرنے والے کو ضرور کامیابی ہوگی، چاہے کسی موقع پر اس کے دل میں یہ خیال بھی آجائے کہ جو کام ہوا وہ اچھا نہیں ہوا، لیکن اس خیال کے آنے کے باوجود کامیابی اسی شخص کو ہوگی جو اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہے۔ اور جو شخص مشورہ کرکے کام کرے گا وہ پچھتائے گا نہیں، اس لئے کہ بالفرض اگر وہ کام خراب بھی ہوگیا تو اس کے دل میں اس بات کی تسلی موجود ہوگی کہ میں نے یہ کام اپنی خود رائی سے اور اپنے بل بوتے پر نہیں کیا تھا بلکہ اپنے دوستوں سے اور بڑوں سے مشورہ کے بعد یہ کام کیا تھا، اب آگے اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے کہ وہ جیسا چاہیں فیصلہ فرمادیں۔ اس لئے اس حدیث میں دو باتوں کا مشورہ دیا ہے کہ جب بھی کسی کام میں کشمکش ہو تو دو کام کرلیا کرو، ایک استخارہ اور دوسرے استشارہ یعنی مشورہ۔

استخارہ کی مختصر دعا

اوپر استخارہ کا جو مسنون طریقہ عرض کیا، یہ تو اس وقت ہے جب آدمی کو استخارہ کرنے کی مہلت اور موقع ہو، اس وقت تو دو رکعت پڑھ کر وہ مسنون دعا پڑھے۔ لیکن بسا اوقات انسان کو اتنی جلدی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کو پوری دو رکعت پڑھ کر دعا کرنے کا موقع ہی نہیں ہوتا، اس لئے کہ اچانک کوئی کام سامنے آگیا اور فوراً اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس موقع کے لئے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا تلقین فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے۔

﴿اَللّٰھُمَّ خِرْلِیْ وَاخْتَرْلِیْ﴾

(کنزل العمال: جلد۷ حدیث نمبر۱۸۰۵۳)

اے اللہ! میرے لئے آپ پسند فرمادیجئے کہ مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ بس یہ دعا پڑھ لے۔ اس کے علاوہ ایک اور دعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے۔

﴿اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ وَسَدِّدْنِیْ﴾

(صحیح مسلم، ابواب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل)

اے اللہ! میری صحیح ہدایت فرمایئے اور مجھے سیدھے راستے پر رکھئے۔

اسی طرح ایک اور مسنون دعا ہے۔

﴿اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ﴾

(ترمذی، کتاب الدعوات، باب نمبر۷۰)

اے اللہ! جو صحیح راستہ ہے وہ میرے دل پر القا فرمادیجئے۔ ان دعاؤں میں سے جو دعا یاد آجائے اس کو اسی وقت پڑھ لے۔ اور اگر عربی میں دعا یاد نہ آئے تو اردو ہی میں دعا کرلو کہ یا اللہ! مجھے یہ کشمکش پیش آگئی ہے آپ مجھے صحیح راستہ دکھا دیجئے۔ اگر زبان سے نہ کہہ سکو تو دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! یہ مشکل اور یہ پریشانی پیش آگئی ہے، آپ صحیح راستہ دل میں ڈال دیجئے۔ جو راستہ آپ کی رضا کے مطابق ہو اور جس میں میرے لئے خیر ہو۔

حضرت مفتیٔ اعظمؒ کا معمول

میں نے اپنے والد ماجد مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ساری عمر یہ عمل کرتے ہوئے دیکھا کہ جب کبھی کوئی ایسا معاملہ

پیش آتا جس میں فوراً فیصلہ کرنا ہوتا کہ یہ دو راستے ہیں، ان میں سے ایک راستے کو اختیار کرنا ہے تو آپ اس وقت چند لمحوں کے لئے آنکھ بند کرلیتے، اب جو شخص آپ کی عادت سے واقف نہیں اس کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ آنکھ بند کرکے کیا کام ہورہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ آنکھ بند کرکے ذرا سی دیر میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیتے اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرلیتے کہ یا اللہ! میرے سامنے یہ کشمکش کی بات پیش آگئی ہے، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا فیصلہ کروں، آپ میرے دل میں وہ بات ڈال دیجئے جو آپ کے نزدیک بہتر ہو۔ بس دل ہی دل میں یہ چھوٹا سا اور مختصر سا استخارہ ہوگیا۔

ہر کام کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلو

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص ہر کام کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ تمہیں اس کا اندازہ نہیں کہ تم نے ایک لمحہ کے اندر کیا سے کیا کرلیا، یعنی اس ایک لمحہ کے اندر تم نے اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑ لیا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرلیا، اللہ تعالیٰ سے خیر مانگ لی اور اپنے لئے صحیح راستہ طلب کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تمہیں صحیح راستہ مل گیا اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا اجر بھی مل گیا اور دعا کرنے کا بھی اجر و ثواب مل گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو بہت پسند فرماتے ہیں کہ بندہ ایسے مواقع پر مجھ سے رجوع کرتا ہے اور اس پر خاص اجر و ثواب بھی عطا فرماتے ہیں۔ اس لئے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ صبح سے لے کر شام تک نہ جانے کتنے واقعات ایسے پیش آتے ہیں جس میں آدمی کو کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یہ کام کروں یا نہ کروں۔ اس وقت فوراً ایک لمحہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے

رجوع کرلو، یا اللہ! میرے دل میں وہ بات ڈال دیجئے جو آپ کی رضا کے مطابق ہو۔

جواب سے پہلے دعا کا معمول

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی اس سے تخلف نہیں ہوتا کہ جب بھی کوئی شخص آکر یہ کہتا ہے کہ حضرت! ایک بات پوچھنی ہے تو میں اس وقت فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ معلوم نہیں یہ کیا بات پوچھے گا؟ اے اللہ! یہ شخص جو سوال کرنے والا ہے اس کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجئے۔ کبھی بھی اس رجوع کرنے کو ترک نہیں کرتا ہوں۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق۔ لہٰذا جب بھی کوئی بات پیش آئے فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلو۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! اپنے اللہ میاں سے باتیں کیا کرو کہ جہاں کوئی واقعہ پیش آئے اس میں فوراً اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ لو، اللہ تعالیٰ سے رجوع کرلو، اس میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرلو اور اپنی زندگی میں اس کام کی عادت ڈال لو۔ رفتہ رفتہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کردیتی ہے، اور یہ تعلق اتنا مضبوط ہوجاتا ہے کہ پھر ہر وقت اللہ تعالیٰ کا دھیان دل میں رہتا ہے۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ کہاں کروگے وہ مجاہدات اور ریاضتیں جو پچھلے صوفیاء کرام اور اولیاء کرام کر کے چلے گئے، لیکن میں تمہیں ایسے چٹکلے بتادیتا ہوں کہ اگر تم ان پر عمل کرلوگے تو انشاء اللہ جو مقصود اصلی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا قائم ہوجانا، وہ انشاء اللہ اسی طرح حاصل ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

احسان کا بدلہ احسان

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

احسان کا بدلہ، احسان

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات أعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضلّ لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد أن لا الٰہ إلا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہٗ، ونشھد أن سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہٗ، صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ وأصحابہ وبارک وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیراً۔

اما بعد!

﴿عن جابر بن عبداللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ قال: قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من اعطی عطاء فوجد فلیجزبہ، ومن لم یجد فلیثن فان من اثنی فقد شکر، ومن کتم فقد کفر، ومن تحلی بمالم یعطہ کان کلابس ثوبی زور﴾

(ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی المتشبع بمالم یعطہ)

حدیث کا ترجمہ

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے ساتھ کوئی نیکی کی جائے اور اس کے پاس نیکی کا بدلہ دینے کے لئے کوئی چیز موجود ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس نیکی کا بدلہ دے، اور اگر

اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے وہ نیکی کا بدلہ دے سکے، تو کم از کم یہ کرے کہ جو نیکی اس کے ساتھ کی گئی ہے، اس کا تذکرہ کرکے اس کی تعریف کرے کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ احسان اور یہ نیکی کی ہے' اس لئے کہ جس شخص نے اس کی تعریف کردی تو گویا کہ اس نے اس کا شکریہ ادا کردیا، اور اگر اس شخص نے اس نیکی اور احسان کو چھپا کر رکھا تو اس نے اس کی ناشکری کی۔ اور جو شخص اس چیز سے آراستہ ہوا جو اس کو نہیں دی گئی تو اس نے گویا جھوٹ کے دو کپڑے پہنے۔ یہ تو حدیث کا ترجمہ تھا۔

نیکی کا بدلہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دو باتوں کی تعلیم دی ہے۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، یا کوئی نیکی کرے، تو اس کو چاہئے کہ جس نے اس کے ساتھ نیکی کی ہے، اس کو اس کا کچھ نہ کچھ بدلہ دے۔ دوسری حدیث میں اسی بدلہ کو "مکافات" سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ بدلہ جس کا ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس احساس کے ساتھ دوسرے سے اچھا برتاؤ کرے کہ اس نے چونکہ میرے ساتھ نیکی کی ہے تو میں بھی اس کے ساتھ کوئی نیک سلوک کروں۔ یہ بدلہ دینا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی شخص آپ کے ساتھ اچھا معاملہ کرتا، یا کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ اس کو بدلہ دیا کرتے تھے، اور اس کے ساتھ بھی اچھائی کا معاملہ کیا کرتے تھے۔ اس لئے یہ بدلہ تو باعث اجر و ثواب ہے۔

"نیوتہ" دینا جائز نہیں

ایک بدلہ وہ ہے جو آج ہمارے معاشرے میں پھیل گیا ہے، وہ یہ کہ کسی کو بدلہ

دینے کو دل تو نہیں چاہ رہا ہے، لیکن اس غرض سے دے رہا ہے کہ اگر میں نہیں دوں گا تو معاشرے میں میری ناک کٹ جائے گی، یا اس نیت سے دے رہا ہے کہ اس وقت دے رہا ہوں تو میرے یہاں شادی بیاہ کے موقع پر یہ دے گا۔ جس کو "نیوتہ" کہا جاتا ہے۔ حتی کہ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر کوئی کسی کو دیتا ہے تو باقاعدہ اس کی فہرست بنتی ہے کہ فلاں شخص نے اتنے دیئے، فلاں شخص نے اتنے دیے۔ پھر اس فہرست کو محفوظ رکھا جاتا ہے، اور پھر جب اس شخص کے یہاں شادی بیاہ کا موقع آتا ہے جس نے دیا تھا تو اس کو پوری توقع ہوتی ہے کہ میں نے اس کو جتنا دیا تھا، یہ کم از کم اتنا ہی مجھے واپس دے گا۔ اور اگر اس سے کم دے تو پھر گلے شکوے، لڑائیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ یہ "بدلہ" بہت خراب ہے۔ اور اسی کو قرآن کریم میں سورۃ روم میں "سود" سے تعبیر فرمایا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ، وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾ (سورۃ روم: ۳۹)

یعنی تم لوگ جو سود دیتے ہو، تاکہ لوگوں کے مالوں کے ساتھ مل کر اس میں اضافہ ہوجائے، تو یاد رکھو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس میں اضافہ نہیں ہوتا، اور جو تم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر زکوٰۃ دیتے ہو، تو یہی لوگ اپنے مالوں میں اضافہ کرانے والے ہیں۔"

اس آیت میں اس "نیوتہ" کو سود سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص دوسرے کو اس نیت سے دے کہ چونکہ اس نے مجھے شادی کے موقع پر دیا تھا، اب میرے ذمے فرض ہے کہ میں بھی اس کو ضرور دوں۔ اگر میں نہیں دوں گا تو معاشرے میں میری ناک کٹ جائے گی اور یہ مجھے مقروض سمجھے گا۔ یہ دینا گناہ میں

داخل ہے، اس میں کبھی مبتلا نہیں ہونا چاہئے، اس میں نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے، اور نہ ہی آخرت کا کوئی فائدہ ہے۔

محبّت کی خاطر بدلہ اور ہدیہ دو

لیکن ایک وہ "بدلہ" جس کی تلقین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں۔ یعنی دینے والے کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ جو میں دے رہا ہوں، اس کا بدلہ مجھے ملے گا بلکہ اس نے محض محبّت کی خاطر اللہ کو راضی کرنے کے لئے اپنے بہن یا بھائی کو کچھ دیا ہو۔ جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿تَهَادَوْا فَتَحَابُّوْا﴾

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو ہدیے دیا کرو، اس سے آپس میں محبت پیدا ہوگی۔ لہٰذا اگر آدمی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کرنے کے لئے اپنے دل کے تقاضے سے دے رہا ہے، اور اس کے دل میں دور دور یہ خیال نہیں ہے کہ اس کا بدلہ بھی مجھے ملے گا، تو یہ دینا بڑی برکت کی چیز ہے۔ اور جس شخص کو وہ ہدیہ دیا گیا وہ بھی یہ سمجھ کر نہ لے کہ یہ "نیوتہ" ہے، اور اس کا بدلہ مجھے ادا کرنا ہے۔ بلکہ وہ یہ سوچے کہ یہ میرا بھائی ہے، اس نے میرے ساتھ ایک اچھائی کی ہے، تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ اچھائی کروں، اور میں بھی اپنی طاقت کے مطابق اس کو ہدیہ دیکر اس کا دل خوش کروں۔ تو اس کا نام ہے "مکافات" جس کی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے۔ یہ محمود ہے اور اس کی کوشش کرنی چاہئے۔

بدلہ دینے میں برابری کا لحاظ مت کرو

اس "مکافات" کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب دوسرا شخص تمہارے ہدیہ کا بدلہ

دے گا تو اس بدلہ میں اس کا لحاظ نہیں ہوگا کہ جتنا قیمتی ہدیہ اس نے دیا تھا، اتنا ہی قیمتی ہدیہ میں بھی دوں۔ بلکہ مکافات کرنے والا یہ سوچے گا کہ اس نے اپنی استطاعت کے مطابق بدلہ دیا تھا، میں اپنی استطاعت کے مطابق بدلہ دوں، مثلاً کسی نے آپ کو بہت قیمتی تحفہ دیدیا تھا، اب آپ کی استطاعت قیمتی تحفہ دینے کی نہیں ہے تو آپ چھوٹا اور معمولی تحفہ دیتے وقت شرمائیں نہیں۔ اس لئے کہ اس کا مقصد بھی آپ کا دل خوش کرنا تھا، اور آپ کا مقصد بھی اس کا دل خوش کرنا ہے، اور دل چھوٹی چیز سے بھی خوش ہوجاتا ہے۔ یہ نہ سوچیں کہ جتنا قیمتی تحفہ اس نے مجھے دیا تھا، میں بھی اتنا ہی قیمتی تحفہ اس کو دوں، چاہے اس مقصد کے لئے مجھے قرض لینا پڑے، چاہے رشوت لینی پڑے، یا اس کے لئے مجھے ناجائز ذرائع آمدنی اختیار کرنے پڑیں، ہرگز نہیں، بلکہ جتنی استطاعت ہو، اس کے مطابق تحفہ دو۔

تعریف کرنا بھی بدلہ ہے

بلکہ اس حدیث میں یہاں تک فرمادیا کہ اگر تمہارے پاس ہدیہ کا بدلہ دینے کے لئے کچھ نہیں ہے تو پھر "مکافات" کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ تم اس کی تعریف کرو، اور لوگوں کو بتاؤ کہ میرے بھائی نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور مجھے ہدیہ میں یہ ضرورت کی چیز دیدی۔ یہ کہہ کر اس کا دل خوش کر دینا بھی ایک طرح کا بدلہ ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انداز

میرے حضرت جناب حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص محبت سے کوئی چیز ہدیہ کے طور پر لے کر آئے تو کم از کم اس پر خوشی کا اظہار کر کے اس کا دل خوش کرو، تاکہ اس کو یہ معلوم ہوجائے کہ تمہیں اس ہدیہ سے خوشی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے حضرت والا کو دیکھا کہ جب کوئی شخص

آپ کے پاس کوئی ہدیہ لے کر آتا تو آپ بہت خوشی سے اس کو قبول فرماتے، اور فرماتے کہ بھائی! یہ تو ہماری پسند کی اور ضرورت کی چیز ہے، آپ کا یہ ہدیہ تو ہمیں بہت پسند آیا، ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ بازار سے یہ چیز خرید لیں گے۔ یہ الفاظ اس لئے فرماتے تاکہ دینے والے کو یہ احساس ہو کہ ان کو میرے ہدیہ سے خوشی ہوئی ہے، اور اس حدیث پر عمل بھی ہو جائے۔ لہٰذا اس کی تعریف کرنی چاہئے۔ اور چھپا کر بیٹھنا اور اس پر اس کی تعریف نہ کرنا اور خوشی کا اظہار نہ کرنا، یہ اس ہدیہ کی ناشکری ہے۔

چھپا کر ہدیہ دینا

ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے، اور مصافحہ کرتے ہوئے چپکے سے کوئی چیز بطور ہدیہ کے دیدی، اس لئے کہ یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ چپکے سے مصافحہ کرتے ہوئے ہدیہ دیدیا جائے، تو ان صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ حضرت والا نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت ہدیہ پیش کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ اس طرح چھپا کر دینے کا کیا مطلب ہے، کیا تم چوری کر رہے ہو، یا میں چوری کر رہا ہوں؟ جب نہ تم چوری کر رہے ہو اور نہ میں چوری کر رہا ہوں، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد پر عمل کرنا چاہتے ہو تو پھر اس کو اس طرح چھپانے کی کیا ضرورت ہے، یہ تو ایک محبت اور تعلق کا اظہار ہے، سب کے سامنے پیش کردو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہرحال ہدیہ کے ذریعہ اصل میں دل کی محبت کا اظہار ہے، چاہے وہ چیز چھوٹی ہو یا بڑی ہو۔ اور جب کوئی شخص تمہیں کوئی چیز دے تو تم اس کا بدلہ دیدو، یا کم از کم اس کی تعریف کردو۔

پریشانی میں درود شریف کی کثرت کیوں؟

ایک مرتبہ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی مشکل اور پریشانی میں ہو تو اس وقت درود شریف کثرت سے پڑھا کرو۔ پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے ذوق میں ایک بات آتی ہے وہ یہ کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہے تو وہ درود شریف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فرشتے پہنچاتے ہیں، اور جاکر عرض کرتے ہیں کہ آپ کے فلاں اُمّتی نے آپ کی خدمت میں درود شریف کا یہ ہدیہ بھیجا ہے — اور دوسری طرف زندگی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت یہ تھی کہ جب کبھی کوئی شخص آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ اس کی "مکافات" ضرور فرماتے تھے، اس کے بدلے میں اس کے ساتھ کوئی نیکی ضرور فرماتے تھے۔ ان دونوں باتوں کے ملانے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جب تم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درود بھیجو گے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا بدلہ نہ دیں، بلکہ ضرور بدلہ دیں گے۔ اور وہ بدلہ یہ ہوگا کہ آپ اس اُمّتی کے حق میں دعا کریں گے کہ اے اللہ! یہ میرا اُمّتی جو مجھ پر درود بھیج رہا ہے، وہ فلاں مشکل اور پریشانی میں مبتلا ہے، اے اللہ! اس کی مشکل دور فرما دیجئے۔ تو اس دعا کی برکت سے انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ تمہیں اس مشکل سے نجات عطا فرمائیں گے۔ اس لئے جب کبھی کوئی پریشانی آئے تو اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کی کثرت کریں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں پہلی تعلیم

یہ دی کہ جب کوئی شخص تمہارے ساتھ نیکی کرے، تو تم اس کو بدلہ دینے کی کوشش کرو، اور اس نیت سے بدلہ دو کہ چونکہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے کہ آپ بدلہ دیا کرتے تھے، اس لئے میں بھی بدلہ دے رہا ہوں۔ لیکن قرضہ والا بدلہ نہ ہو، "نیوتہ" والا بدلہ نہ ہو، بلکہ وہ بدلہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت پر عمل کرنے کے لئے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دَعْوانا اَنِ الحَمْدُ للّٰہِ رَبِّ العٰلمین

تعمیر مسجد کی اہمیت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی
وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب
اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعمیر مسجد کی اہمیت

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات أعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضلّ لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد أن لا الٰہ إلا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہٗ ونشھد أن سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہٗ، صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ وأصحابہ وبارک وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیراً۔

امابعد!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الاٰخِرِ﴾ (التوبۃ:۱۸)

آمنت باللّٰہ صدق اللّٰہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم۔ ونحن علی ذلک من الشاھدین والشاکرین، والحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

تمہید

جناب صدر و مہمانان گرامی اور معزز حاضرین! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ ہم سب کے لئے یہ بڑی سعادت کا موقع ہے کہ آج ہم سب کا ایک مسجد کی تعمیر کی سنگ بنیاد میں حصہ لگنے والا ہے۔ مسجد کی تعمیر کرنا یا اس میں کسی طرح کا حصہ لینا

ایک مسلمان کے لئے بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ جو آیت ابھی میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مسجدیں صرف وہی لوگ آباد کرتے ہیں جن کا اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان ہو۔ لہٰذا مسجد کی تعمیر انسان کے ایمان کی علامت ہے اور اس کے ایمان کا اوّلین تقاضہ ہے۔

مسجد کا مقام

اسلامی معاشرے میں مسجد کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی مسلمان سے پوشیدہ نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کا ستون قرار دیا اور فرمایا کہ جو شخص نماز قائم کرتا ہے وہ دین کو قائم کرتا ہے اور جو شخص نماز کو چھوڑتا ہے وہ دین کے بنیادی ستون کو توڑتا ہے، اور چونکہ وہی نماز اللہ تعالیٰ کے یہاں صحیح معنیٰ میں مقبول ہے جو نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کی جائے، اور جو نماز گھر کے اندر پڑھ لی جائے، اس کو فقہاء کی اصطلاح میں اداء قاصر کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ نماز ناقص ہے۔ نماز کی کامل ادائیگی یہ ہے کہ انسان جماعت کے ساتھ مسجد میں نماز ادا کرے۔

مسلمان اور مسجد

اس لئے مسلمانوں کا یہ طغرۂ امتیاز رہا کہ وہ جہاں کہیں گئے اور جس خطے اور علاقے میں پہنچے وہاں پر اپنا گھر تعمیر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن سب سے پہلے انہوں نے وہاں جاکر اللہ کے گھر کی بنیاد ڈالی، اور ایسے سنگین اور خطرناک حالات میں بھی اس فریضے کو نہیں چھوڑا جبکہ ان کی جانوں پر بنی ہوئی تھی، اور جبکہ مال کی بھی کمی تھی، فقر و فاقہ کا دور دورہ تھا، ان حالات میں بھی اُمتِ مسلمہ نے مسجد کی تعمیر کو کسی حال میں پس پشت نہیں ڈالا۔

جنوبی افریقہ کا ایک واقعہ

مجھے یاد آیا، آج سے تقریباً سات سال پہلے مجھے جنوبی افریقہ جانے کا اتفاق ہوا۔ جنوبی افریقہ وہ ملک ہے جو افریقہ کے براعظم میں انتہائی جنوبی کنارے پر واقع ہے اور اس کا مشہور شہر کیپ ٹاؤن ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اس شہر میں جاکر میں نے دیکھا کہ وہاں پر زیادہ تر "ملایا" کے لوگ آباد ہیں۔ جو آج کل "ملیشیا" کہلاتا ہے۔ جو مسلمان وہاں آباد ہیں، ان میں اسّی فیصد "ملایا" کے لوگ ہیں۔ میں نے پوچھا کہ "ملایا" کے لوگ یہاں کیسے پہنچ گئے، تو اس وقت مجھے اس کی بڑی عجیب تاریخ بتائی گئی جو ہم سب کے لئے بڑی عبرت کا سامان ہے۔

"ملایا" والوں کی کیپ ٹاؤن آمد

لوگوں نے بتایا کہ یہ دراصل "ملایا" کے وہ لوگ ہیں کہ جب انگریزوں نے "ملایا" کی ریاست پر قبضہ کیا اور ان کو غلام بنایا (جس طرح ہندوستان پر قبضہ کیا تھا اور ان کو غلام بنایا تھا) تو یہ وہ لوگ تھے جو انگریزوں کی حکومت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ یہ لوگ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جہاد کرتے رہے۔ چونکہ یہ لوگ بے سرو سامان تھے، ان کے پاس وسائل کم تھے، اس لئے انگریز ان پر غالب آگئے اور انگریزوں نے ان کو گرفتار کر کے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اور غلام بنا کر کیپ ٹاؤن لے آئے۔ اس طرح ان "ملایا" کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یہاں پہنچ گئی۔ آج یہ انگریز اور مغربی ممالک والے بڑی رواداری اور جمہوریت اور آزادیٔ اظہارِ رائے کا سبق دیتے ہیں، لیکن اس وقت ان کا یہ حال تھا کہ جن کو غلام بنایا تھا، ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں اور ان کو اپنے دین اور عقیدے کے مطابق نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی، وہ اگر اپنے گھر میں بھی نماز پڑھنا چاہتے تو اس کی بھی ان کو اجازت نہیں تھی، اگر کوئی

شخص نماز پڑھتا ہوا پایا جاتا تو اس کے اوپر ہنٹر برسائے جاتے۔

رات کی تنہائی میں نماز کی ادائیگی

ان لوگوں سے دن بھر محنت مزدوری کے کام لئے جاتے، مشقت والے کام ان سے لئے جاتے اور شام کو جب کھانا کھانے کے بعد رات کو ان کے آقا سوجاتے تو سوتے وقت ان کے پاؤں سے بیڑیاں کھولی جاتیں تاکہ یہ اپنے بیرکوں میں جاکر سوجائیں، لیکن جب ان کی بیڑیاں کھول دی جاتیں اور ان کے آقا سوجاتے تو یہ لوگ چپکے چپکے ایک ایک کر کے وہاں سے نکل کر قریب کے پہاڑ کی چوٹی پر جاکر پورے دن کی نمازیں اکٹھے جماعت سے ادا کرتے۔ اسی طرح یہ لوگ ایک عرصہ تک نمازیں ادا کرتے رہے۔

نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کیپ ٹاؤن پر ڈچ قوم نے حملہ کردیا تاکہ کیپ ٹاؤن پر قبضہ کرلیں۔ چونکہ "ملایا" کے یہ لوگ بڑے جنگ جو تھے، اور بڑے بہادر تھے، اور ان کی بہادری کے کرشمے انگریز دیکھ چکے تھے، اس لئے انگریزوں نے ان سے کہا کہ ہمارے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم تمہیں آگے کرتے ہیں، تم ان سے مقابلہ کرو اور لڑو، تاکہ یہ لوگ کیپ ٹاؤن پر قبضہ نہ کرلیں۔ ان "ملایا" کے مسلمانوں نے ان سے کہا کہ تم حکمرانی کرو یا ڈچ حکمرانی کرے، ہمارے لئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، صرف آقاؤں کی تبدیلی کی بات ہے، آج تم آقا ہو کل کو ان کا قبضہ ہوا تو وہ آقا بن جائیں گے، ان کے آنے یا نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ ہم ان سے لڑیں تو ہم لڑنے کے لئے تیار ہیں، لیکن ہمارا ایک مطالبہ ہے وہ یہ کہ اس کیپ ٹاؤن کی زمین پر ہمیں نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے اور ایک مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔

صرف مسجد بنانے کا مطالبہ

دیکھئے! انہوں نے پیسے کا کوئی مطالبہ نہیں رکھا، آزادی کا مطالبہ نہیں کیا، کوئی اور دنیاوی مطالبہ نہیں کیا، مطالبہ کیا تو صرف یہ کہ ہمیں مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی بہادری سے ڈچ قوم کا مقابلہ کیا، حتیٰ کہ ان کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا اور ان کو فتح حاصل ہوگئی۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم نے جو مسجد کی تعمیر کرنے کی اجازت کا مطالبہ کیا تھا وہ پورا کیا جائے، چنانچہ ان کو اجازت مل گئی۔ اور پورے کیپ ٹاؤن میں پہلی مسجد اس حالت میں تعمیر کی گئی کہ ان بیچاروں کے پاس نہ آلات و اسباب تھے، اور نہ ہی تعمیر کرنے کے لئے سرمایہ تھا، یہاں تک کہ قبلہ کا صحیح رخ معلوم کرنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا، محض اندازے سے قبلہ کے رخ کا تعین کیا۔ چنانچہ اس کا رخ قبلہ کے صحیح سمت سے ۲۰ یا ۲۵ ڈگری ہٹا ہوا ہے۔ آج اس مسجد میں صفیں ٹیڑھی کر کے بنائی جاتی ہیں۔

تو انہوں نے نہ تو یہ مطالبہ کیا کہ ہمیں رہنے کے لئے مکان دو، نہ یہ مطالبہ کیا کہ ہمیں پیسے دو، نہ یہ مطالبہ کیا کہ ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کرو، بلکہ پہلا مطالبہ یہ کیا کہ ہمیں مسجد بنانے کی اجازت دو۔ یہ ہے ایک اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ، کہ اس نے مسجد کی تعمیر کو ہر چیز پر مقدم رکھا اور ان حالات میں بھی مسجد کی تعمیر کے فریضے کو نہیں چھوڑا۔

ایمان کی حلاوت کس کو؟

حقیقت میں ایمان کی حلاوت انہی جیسے لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، ہمیں اور آپ کو تو بیٹھے بٹھائے یہ دین حاصل ہوگیا، مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوگئے اور اپنے ماں باپ کو مسلمان پایا۔ اس دین کو حاصل کرنے کے لئے کوئی قربانی نہیں دی، کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا، کوئی محنت نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس دین کی

ہمارے دلوں میں کوئی قدر نہیں۔ لیکن جن لوگوں نے اس کام کے لئے محنت کی، قربانیاں دیں، مشقتیں جھیلیں، ان کو درحقیقت ایمان کی صحیح حلاوت نصیب ہوتی ہے۔

ہمیں شکر کرنا چاہئے

یہ واقعہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسجد کی تعمیر کرنے میں ہم پر کوئی پابندی عائد نہیں، کوئی پریشانی اور الجھن نہیں، بلکہ جب اور جہاں مسجد بنانا چاہیں، مسجد بنا سکتے ہیں۔ لہٰذا مسجد کی تعمیر کا یہ موقع ہم سب کے لئے بڑی سعادت کا موقع ہے، اور اس تعمیر میں جو شخص بھی جس جہت سے دامے، درمے، قدمے، سخنے، جس طرح بھی ممکن ہو، حصّہ لے تو اس کے لئے بڑی عظیم سعادت کی بات ہے۔

مسجد کی آبادی نمازیوں سے

دوسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ مسجد کی تعمیر دیواروں سے، بلاکوں سے، اینٹوں سے، پلاسٹر سے اور چونا پتھر سے نہیں ہوتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ مدنیہ منوّرہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جو مسجد تعمیر فرمائی یعنی مسجد نبویؐ، اس کی چھت بھی پکی نہیں تھی، اس کی دیواریں بھی پکی نہیں تھیں، بلکہ کھجور کے پتوں کی دیواریں کھڑی کردی گئی تھیں، لیکن روئے زمین پر مسجد حرام کے بعد اس سے زیادہ افضل مسجد کوئی وجود میں نہیں آئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد ان دیواروں کا نام نہیں. مسجد ان میناروں کا نام نہیں، اس محراب اور ان پتھر اور چونے کا نام نہیں، بلکہ مسجد درحقیقت سجدہ کرنے والوں کا نام ہے۔ اگر بڑی عالیشان مسجد تعمیر کردی گئی اور اس پر دنیا بھر کی دولت خرچ کر کے اس پر نقش و نگار بنادیئے گئے، لیکن وہ مسجد نماز پڑھنے والوں سے خالی ہے تو وہ مسجد آباد نہیں ہے بلکہ وہ مسجد

ویران ہے۔ لہٰذا مسجد کی آبادی وہاں پر نماز پڑھنے والوں سے اور وہاں پر ذکر کرنے والوں سے ہوتی ہے۔

قربِ قیامت میں مساجد کی حالت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے قریب کے حالات کی پیشن گوئی کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ آخر دور میں ایسا زمانہ آجائے گا کہ: مَسَاجِدُ هُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ یعنی بظاہر ان کی مسجدیں آباد ہونگی، تعمیر شدہ ہونگی، اور دیکھنے میں بڑی عالیشان مسجدیں نظر آئیں گی، لیکن اندر سے وہ ویران ہونگی، اس لئے کہ ان میں نماز پڑھنے والے بہت کم ہونگے، اور جن کاموں کے لئے مسجد بنائی جاتی ہے، ان کاموں کی ادائیگی کرنے والے بہت کم ہونگے۔ ایسی مسجد کے بارے میں فرمایا کہ بظاہر وہ آباد ہے لیکن حقیقت میں وہ ویران ہے۔ اسی کی طرف اقبال مرحوم نے اس شعر میں اشارہ کیا کہ ؎

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے
من اپنا پُرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اختتام

بہرحال، جو لوگ اس مسجد کی تعمیر میں جس جہت سے بھی حصّہ لے رہے ہیں، ان کے لئے بڑی سعادت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کام کی مشکلات کو ان کے لئے آسان فرمائے اور اس کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ آمین۔

لیکن یہ بات کبھی نہ بھولئے کہ مسجد کے سلسلے میں ہمارا فریضہ صرف عمارت کھڑی کردینے پر ختم نہیں ہوتا بلکہ عمارت کھڑی کردینے کے بعد یہ بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے کہ ہم اس کو نماز سے آباد کریں، تلاوت سے آباد کریں، اللہ

کے ذکر سے آباد کریں۔ اسلامی معاشرے میں مسجد درحقیقت ایک مرکزی مقام کی حامل ہے، اس لئے کہ وہاں سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، وہاں کردار کی تعمیر ہوتی ہے، اخلاقِ فاضلہ کی تعمیر ہوتی ہے۔ انہی کاموں کے لئے اس مسجد کو تعمیر کیا جارہا ہے، تاکہ یہ مسجد ظاہری اعتبار سے بھی آباد ہو اور باطنی اعتبار سے بھی آباد ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کو تمام اہل محلّہ کے لئے باعث خیر و برکت بنائے اور تمام اہل محلّہ کو اس سلسلے میں اپنے فرائض ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس مسجد کو صحیح معنیٰ میں آباد رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

رزقِ حلال طلب کریں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی
وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب
اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رزقِ حلال کی طلب

ایک دینی فریضہ

الحمد للّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره و نؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيّات اعمالنا، من يهده اللّٰه فلا مضلّ له ومن يضلله فلا هادى له، ونشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لاشريك له، ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله، صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وعلى أله واصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيرًا كثيرا۔

امابعد!

﴿عن عبد اللّٰه بن مسعود رضى اللّٰه عنه ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة﴾ (کنز العمال جلد ۴ حدیث نمبر ۹۲۳۱)

رزق حلال کی طلب دوسرے درجے کا فریضہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رزقِ حلال کو طلب کرنا دین کے اوّلین فرائض

کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔ اگرچہ سند کے اعتبار سے محدثین نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے لیکن علماء اُمت نے اس حدیث کو معنیٰ کے اعتبار سے قبول کیا ہے، اور اس بات پر ساری اُمت کے علماء کا اتفاق ہے کہ معنیٰ کے اعتبار سے یہ حدیث صحیح ہے۔ اس حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم اصول بیان فرمایا ہے، وہ یہ کہ رزقِ حلال کو طلب کرنا دین کے اوّلین فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔ یعنی دین کے اوّلین فرائض تو وہ ہیں جو ارکان اسلام کہلاتے ہیں اور جن کے بارے میں ہر مسلمان جانتا ہے کہ یہ چیزیں دین میں فرض ہیں۔ مثلاً نماز پڑھنا، زکوٰۃ ادا کرنا، روزہ رکھنا، حج کرنا وغیرہ۔ یہ سب دین کے اوّلین فرائض ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان دینی فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ "رزقِ حلال کو طلب کرنا اور رزقِ حلال کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا" ہے۔ یہ ایک مختصر سا ارشاد اور مختصر سی تعلیم ہے، لیکن اس حدیث میں بڑے عظیم علوم بیان فرمائے گئے ہیں۔ اگر آدمی اس حدیث میں غور کرے تو دین کی فہم عطا کرنے کے لئے اس میں بڑا سامان ہے۔

رزقِ حلال کی طلب دین کا حصّہ ہے

اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ہم اور آپ رزقِ حلال کی طلب میں جو کچھ کارروائی کرتے ہیں، چاہے وہ تجارت ہو، چاہے وہ کاشت کاری ہو، چاہے وہ ملازمت ہو، چاہے وہ مزدوری ہو، یہ سب کام دین سے خارج نہیں ہیں بلکہ یہ سب بھی دین کا حصّہ ہیں اور نہ صرف یہ کہ یہ کام جائز اور مباح ہیں بلکہ ان کو فریضہ قرار دیا گیا ہے اور نماز، روزے کے فرائض کے بعد اس کو بھی دوسرے درجے کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کام نہ کرے اور رزق حلال کی طلب نہ کرے بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھ جائے تو وہ شخص فریضہ کے ترک کرنے کا گناہ گار ہوگا، اس لئے کہ اس نے ایک فرض اور واجب کام کو چھوڑ رکھا

ہے، کیونکہ شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان سُست ہو کر اور بیکار ہو کر نہ بیٹھ جائے اور کسی دوسرے کا دست نگر نہ بنے، اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔ اور ان چیزوں سے بچنے کا راستہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمادیا کہ آدمی اپنی وسعت اور کوشش کے مطابق رزقِ حلال طلب کرتا رہے تاکہ کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق ہمارے اوپر واجب فرمائے ہیں، اسی طرح کچھ حقوق ہمارے اوپر ہمارے نفس سے متعلّق اور ہماری ذات سے متعلّق اور ہمارے گھروالوں سے متعلّق بھی واجب فرمائے ہیں، اور رزقِ حلال کی طلب کے بغیر یہ حقوق ادا نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ان حقوق کی ادائیگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی رزقِ حلال طلب کرے۔

اسلام میں "رہبانیت" نہیں

اس حدیث کے ذریعہ اسلام نے "رہبانیت" کی جڑ کاٹ دی۔ عیسائی مذہب میں رہبانیت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا راستہ اور طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے دنیاوی کاروبار کو چھوڑے اور اپنے نفس اور ذات کے مطالبوں کو ختم کرے اور جنگل میں جاکر بیٹھ جائے اور وہاں پر اللہ اللہ کیا کرے۔ بس اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے اندر نفسانی تقاضے رکھے، بھوک اس کو لگتی ہے، پیاس اس کو لگتی ہے، جسم ڈھانپنے کے لئے اس کو کپڑے کی بھی ضرورت ہے، سرچھپانے کے لئے اس کو مکان کی بھی ضرورت ہے، یہ سارے تقاضے ہم نے اس کے اندر پیدا کئے۔ اب ہمارا مطالبہ اس انسان سے یہ ہے کہ وہ ان تقاضوں کو بھی پورا کرے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے حقوق بھی ادا کرے، تب وہ انسان کامل بنے گا۔ اور اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ

رکھ کر بیٹھ گیا تو ایسا انسان چاہے کتنا ہی ذکر و شغل میں مشغول ہو لیکن ایسا شخص ہمارے یہاں قبولیت کا اور قرب کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

حضور ﷺ اور رزق حلال کے طریقے

دیکھئے! جتنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اس دنیا میں تشریف لائے، ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے کسب حلال کا کام ضرور کرایا اور حلال رزق کے حصول کیلئے ہر نبی نے جدّوجہد کی، کوئی نبی مزدوری کرتے تھے، کوئی نبی بڑھئی کا کام کرتے تھے، کوئی نبی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ مکرّمہ کے پہاڑوں پر اجرت پر بکریاں چرائیں۔ بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یاد ہے کہ میں اجیاد کے پہاڑ پر لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ بہر حال، بکریاں آپ نے چرائی، مزدوری آپ نے کی، تجارت آپ نے کی۔ چنانچہ تجارت کے سلسلے میں آپ نے شام کے دو سفر کئے، جس میں آپ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا سامان تجارت لیکر شام تشریف لے گئے۔ زراعت آپ نے کی۔ مدینہ طیبہ سے کچھ فاصلے پر مقام جُرف تھا، وہاں پر آپ نے زراعت کا کام کیا۔ لہٰذا کسب حلال کے جتنے طریقے ہیں ان سب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصّہ اور آپ کی سُنّت موجود ہے۔ اگر کوئی شخص ملازمت کر رہا ہے تو یہ نیت کرلے کہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی اتباع میں یہ ملازمت کر رہا ہوں۔ اگر کوئی شخص تجارت کر رہا ہے تو وہ یہ نیت کرلے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں تجارت کر رہا ہوں اور اگر کوئی زراعت کر رہا ہے تو وہ یہ نیت کرلے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں زراعت کر رہا ہوں تو اس صورت میں یہ سب کام دین کا حصّہ بن جائیں گے۔

مؤمن کی دنیا بھی دین ہے

اس حدیث نے ایک غلط فہمی یہ دور کردی ہے کہ دین اور چیز کا نام ہے اور دنیا

کسی الگ چیز کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان غور سے دیکھے تو ایک مؤمن کی دنیا بھی دین ہے، جس کام کو وہ دنیا کا کام سمجھ رہا ہے یعنی رزق حاصل کرنے کی فکر اور کوشش، یہ بھی درحقیقت دین ہی کا حصّہ ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طریقے سے کرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی اتباع میں کرے۔ بہرحال، ایک بات تو اس سے یہ معلوم ہوئی کہ رزقِ حلال کی طلب بھی دین کا حصّہ ہے۔ اگر یہ بات ایک مرتبہ ذہن میں بیٹھ جائے تو پھر بے شمار گمراہیوں کا راستہ بند ہوجائے۔

بعض صوفیاء کرامؒ کا توکّل کر کے بیٹھ جانا

بعض صوفیاء کرام کی طرف یہ منسوب ہے اور ان سے یہ طرز عمل منقول ہے کہ انہوں نے کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا اور رزق کی طلب میں کوئی کام نہیں کیا بلکہ توکّل کی زندگی اس طرح گزار دی کہ بس اپنی جگہ پر بیٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ غیب سے بھیج دیا اس پر شکر کیا اور قناعت کرلی، اگر نہیں بھیجا تو صبر کرلیا، بعض صوفیاء کرام سے یہ طرز عمل منقول ہے۔ اس بارے میں یہ سمجھ لیں کہ صوفیاء کرام سے اس قسم کا جو طرز عمل منقول ہے وہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ صوفیاء کرام ایسے تھے جن پر غلبہ حال کی کیفیت طاری ہوئی اور وہ استغراق کے عالم میں تھے اور اپنے عام ہوش و حواس کے عالم میں نہیں تھے، اور جب انسان اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو تو وہ احکام شریعت کا مکلّف نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے اگر ان صوفیاء کرامؒ نے یہ طرز عمل اختیار کیا تو یہ ان کا اپنا مخصوص معاملہ تھا، تمام اُمّت کے لئے وہ عام حکم نہیں تھا۔

یا پھران صوفیاء کرام کا توکّل اتنا زبردست اور کامل تھا کہ وہ اس بات پر راضی تھے کہ اگر ہم پر مہینوں فاقہ بھی گزرتا ہے تو ہمیں کوئی فکر نہیں، ہم نہ تو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے، نہ کسی کے سامنے شکوہ کریں گے۔ یہ

صوفیاء بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے، بڑے اعلیٰ درجے کے مقامات پر فائز تھے، انہوں نے اسی پر اکتفا کیا کہ ہم اپنے ذکر و شغل میں مشغول رہیں گے اور اس کے نتیجے میں فاقے کی نوبت آتی ہے تو کوئی بات نہیں۔ اور ان کے ساتھ دوسروں کے حقوق وابستہ نہیں تھے، نہ بیوی بچے تھے کہ ان کو کھانا کھلانا ہو۔ لہٰذا یہ ان صوفیاء کرام کے مخصوص حالات تھے اور ان کا خاص طرز عمل تھا جو عام لوگوں کے لئے اور ہم جیسے کمزوروں کے لئے قابل تقلید نہیں ہے۔ ہمارے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنّت کا جو راستہ بتایا وہ یہ ہے کہ رزقِ حلال کی طلب دوسرے دینی فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔

طلب "حلال" کی ہو

دوسری بات یہ ہے کہ رزق طلب کرنا فریضہ اس وقت ہے جب طلب حلال کی ہو، روٹی، کپڑا اور پیسہ بذات خود مقصود نہیں ہے، یہ نیت نہ ہو کہ بس پیسہ حاصل کرنا ہے، چاہے جس طرح بھی حاصل ہو، چاہے جائز طریقے سے حاصل ہو یا ناجائز طریقے سے حاصل ہو، حلال طریقے سے حاصل ہو یا حرام طریقے سے حاصل ہو۔ اس صورت میں یہ طلب، ب حلال نہ ہوئی جس کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور جس کو فریضہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ مؤمن کا یہ عمل اس وقت دین بنتا ہے جب وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق اس کو حاصل کرے۔ اب اگر اس نے حلال و حرام کی تمیز ہٹا دی اور جائز و ناجائز کا سوال ذہن سے مٹا دیا تو پھر ایک مسلمان میں اور کافر میں رزق حاصل کرنے کے اعتبار سے کوئی فرق نہ رہا۔ بات تو جبھی بنے گی جب وہ رزق تو ضرور طلب کرے لیکن اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کے اندر کرے۔ اس کو ایک ایک پیسے کے بارے میں فکر لاحق ہو کہ یہ پیسہ حلال طریقے سے آرہا ہے یا حرام طریقے سے آرہا ہے، یہ پیسہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق آرہا ہے یا اس کے خلاف آرہا ہے، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف آرہا ہے تو اس کو جہنم کا انگارہ سمجھ کر

چھوڑ دے۔ کتنی بڑی سے بڑی دولت ہو، لیکن اگر وہ حرام طریقے سے آرہی ہے تو اس کو لات مار دے اور کسی قیمت پر بھی اس حرام کو اپنی زندگی کا حصّہ بنانے پر راضی نہ ہو۔

محنت کی ہر کمائی حلال نہیں ہوتی

بعض لوگوں نے وہ ذریعہ معاش اختیار کر رکھا ہے جو حرام ہے اور شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ مثلاً سود کا ذریعہ معاش اختیار کیا ہوا ہے، اب اگر ان سے کہا جائے کہ یہ تو ناجائز اور حرام ہے، اس طریقے سے پیسے نہیں کمانے چاہئیں، تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہم تو اپنی محنت کا کھا رہے ہیں، اپنی محنت لگا رہے ہیں، اپنا وقت صرف کر رہے ہیں، اب اگر وہ کام حرام اور ناجائز ہے تو ہمارا اس سے کیا تعلّق؟

خوب سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر محنت جائز نہیں ہوتی، بلکہ وہ محنت جائز ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو، اگر اس طریقے کے خلاف انسان ہزار محنت کرلے لیکن اس کے ذریعہ جو پیسے کمائے گا وہ پیسے حلال کے نہیں ہوں گے بلکہ حرام ہوں گے۔ اب کہنے کو تو ایک "طوائف" بھی محنت کرتی ہے، وہ بھی کہہ سکتی ہے کہ میں اپنی محنت کے ذریعہ پیسے کمارہی ہوں، لہٰذا میری آمدنی حلال ہونی چاہئے۔ اسی طرح آمدنی کے جو ذرائع حرام ہیں ان کو یہ کہہ کر حلال کرنے کی کوشش کرنا کہ یہ ہماری محنت کی آمدنی ہے، شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہ روزگار حلال ہے یا حرام؟

لہٰذا جب روزگار کا کوئی ذریعہ سامنے آئے تو پہلے یہ دیکھو کہ وہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ شریعت نے اس کو حلال قرار دیا ہے یا حرام؟ اگر شریعت نے حرام قرار دیا

ہے تو پھر اس ذریعہ آمدنی سے خواہ کتنے ہی دنیاوی فائدے حاصل ہو رہے ہوں، انسان اس کو چھوڑ دے، اور اس ذریعہ کو اختیار کرے جو اللہ کو راضی کرنے والا ہو، چاہے اس میں آمدنی اور منافع کم ہو۔

بینک کا ملازم کیا کرے؟

چنانچہ بہت سے لوگ بینک کی ملازمت کے اندر مبتلا ہیں اور بینک کے اندر بہت سارا کاروبار سود پر ہوتا ہے۔ اب جو شخص وہاں ملازم ہے اگر وہ سود کے کاروبار میں ان کے ساتھ معاون بن رہا ہے تو یہ ملازمت ناجائز اور حرام ہے۔ چنانچہ علماء کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بینک کی ایسی ملازمت میں مبتلا ہو اور بعد میں اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دیں اور اس کو بینک کی ملازمت چھوڑنے کی فکر ہوجائے تو اس کو چاہئے کہ کوئی جائز ذریعہ آمدنی تلاش کرے اور جب دوسرا ذریعہ آمدنی مل جائے تو اس کو چھوڑ دے، لیکن جائز ذریعہ آمدنی اس طرح تلاش کرے جس طرح ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، یہ نہ ہو کہ بے فکری کے ساتھ بینک کی ناجائز ملازمت میں لگا ہوا ہے اور ذہن میں یہ بٹھا رکھا ہے کہ جب دوسری ملازمت مل جائے گی تو اس کو چھوڑ دوں گا، بلکہ اس طرح تلاش کرے جس طرح ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، اور جب دوسری ملازمت مل جائے تو موجودہ ملازمت کو ترک کردے اور اس کو اختیار کرلے، چاہے اس میں آمدنی کم ہو۔

حلال روزی میں برکت

اللہ تعالیٰ نے حلال روزی کے اندر جو برکت رکھی ہے وہ حرام کے اندر نہیں رکھی۔ حرام کی بہت بڑی رقم سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو حلال کی تھوڑی سی رقم میں حاصل ہوجاتا ہے۔ حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر وضو کے بعد یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

﴿اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ﴾

(ترمذی، کتاب الدعوات، باب دعاء یقال فی اللیل۔ حدیث نمبر ۳۴۹۶)

اے اللہ، میرے گناہ کی مغفرت فرما اور میرے گھر میں وسعت فرما اور میرے رزق میں برکت عطا فرما۔ آجکل لوگ برکت کی قدر و قیمت کو نہیں جانتے بلکہ روپے پیسے کی گنتی کو جانتے ہیں، یہ دیکھ کر خوش ہوجاتے ہیں کہ ہمارا بینک بیلنس بہت زیادہ ہوگیا، روپے کی گنتی زیادہ ہوگئی، لیکن اس روپے سے کیا فائدہ حاصل ہوا، ان روپوں سے کتنی راحت ملی، کتنا سکون حاصل ہوا؟ اس کا حساب نہیں کرتے۔ لاکھوں کا بینک بیلنس ہے، لیکن سکون میسّر نہیں، راحت میسّر نہیں۔ بتایئے! وہ لاکھوں کا بینک بیلنس کس کام کا؟ اور اگر پیسے تو تھوڑے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے راحت اور سکون عطا فرمایا ہوا ہے تو یہ درحقیقت "برکت" ہے۔ اور یہ "برکت" وہ چیز ہے جو بازار سے خرید کر نہیں لائی جاسکتی، لاکھوں اور کروڑوں خرچ کر کے بھی حاصل نہیں کی جاسکتی، بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی دَین اور اس کی عطا ہے، اللہ تعالیٰ جس کو عطا فرما دیں اسی کو یہ برکت نصیب ہوتی ہے، دوسرے کو نصیب نہیں ہوتی۔ اور یہ برکت حلال رزق میں ہوتی ہے، حرام مال کے اندر یہ برکت نہیں ہوتی، چاہے وہ حرام مال کتنا زیادہ حاصل ہوجائے۔ اس لئے انسان جو کما رہا ہے وہ اس کی فکر کرے کہ یہ لقمہ جو میرے اور بیوی بچوں کے حلق میں جارہا ہے، اور یہ پیسہ جو میرے پاس آرہا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہے یا نہیں؟ شریعت کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں؟ ہر انسان اپنے اندر یہ فکر پیدا کرے۔

تنخواہ کا یہ حصّہ حرام ہوگیا

پھر بعض حرام مال وہ ہیں جن کا علم سب کو ہے، مثلاً سب جانتے ہیں کہ سود حرام ہے، رشوت لینا حرام ہے وغیرہ، لیکن ہماری زندگی میں ان کے علاوہ بھی بہت

سی آمدنیاں اس طرح داخل ہوگئی ہیں کہ ہمیں ان کے بارے میں یہ احساس بھی نہیں کہ یہ آمدنیاں حرام ہیں، مثلاً آپ نے کسی جگہ پر جائز اور شریعت کے مطابق ملازمت اختیار کر رکھی ہے، لیکن ملازمت کا جو وقت طے ہوچکا ہے اس وقت میں آپ کمی کررہے ہیں اور پورا وقت نہیں دے رہے ہیں بلکہ ڈنڈی مار رہے ہیں، جیسے ایک شخص کی آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہے مگر وہ ان میں سے ایک گھنٹہ چوری چھپے دوسرے کاموں میں ضائع کردیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مہینے کے ختم پر جو تنخواہ ملے گی اس کا آٹھواں حصہ حرام ہوگیا۔ وہ آٹھواں حصہ رزقِ حلال نہ رہا بلکہ وہ رزق حرام ہوگیا، لیکن ہمیں اس کا احساس ہی نہیں کہ یہ حرام مال ہماری آمدنی میں شامل ہورہا ہے۔

تھانہ بھون کے مدرسہ کے اساتذہ کا تنخواہ کٹوانا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں جو مدرسہ تھا، اس مدرسہ کے ہر استاد اور ہر ملازم کے پاس ایک روزنامچہ رکھا رہتا تھا، مثلاً ایک استاد ہے اور اس کو چھ گھنٹے سبق پڑھانا ہے، اب سبق پڑھانے کے دوران اس کے پاس کوئی مہمان ملنے کے لئے آگیا تو جس وقت مہمان آتا، وہ استاد اس کے آنے کا وقت اس روزنامچے میں لکھ لیتا، اور پھر جب وہ مہمان رخصت ہو کر واپس جاتا تو اس کے جانے کا وقت بھی نوٹ کرلیتا۔ سارا مہینہ وہ اسی طرح کرتا اور جب مہینے کے آخر میں تنخواہ ملنے کا وقت آتا تو وہ استاد دفتر میں ایک درخواست دیتا کہ اس ماہ کے دوران میرا اتنا وقت مہمانوں کے ساتھ صرف ہوا ہے، لہٰذا اتنی دیر کی تنخواہ میری تنخواہ میں سے کم کرلی جائے۔ اس طرح ہر استاد اور ہر ملازم درخواست دے کر اپنی تنخواہ کٹواتا۔ صرف مہمان کے آنے کی حد تک نہیں بلکہ مدرسہ کا وہ وقت کسی بھی ذاتی کام میں صرف ہوتا تو وہ وقت نوٹ کرکے اس کی تنخواہ کٹواتا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ وقت بکا ہوا ہے، اب یہ وقت ہمارا نہیں ہے، جس ادارے

میں آپ نے ملازمت کی ہے وہ وقت اس ادارے کی ملکیت بن گیا، اب اگر آپ نے اس وقت کے اندر کمی کی تو اتنے وقت کی تنخواہ آپ کے لئے حرام ہوگئی۔ آج ہم لوگوں کو اس طرف دھیان نہیں ہے، ہم لوگ تو صرف سود کھانے اور رشوت لینے کو حرام سمجھتے ہیں، لیکن ان مختلف طریقوں سے ہماری آمدنیوں میں جو حرام کی آمیزش ہو رہی ہے اس کی طرف ہمارا ذہن نہیں جاتا۔

ٹرین کے سفر میں پیسے بچانا

یا مثلاً آپ ٹرین میں سفر کر رہے ہیں اور جس درجے کا آپ نے ٹکٹ خریدا ہے اس سے اونچے درجے کے ڈبے میں سفر کرلیا، اور دونوں درجوں کے درمیان کرایہ کا جو فرق ہے اتنے پیسے آپ نے بچالئے، تو جو پیسے بچے وہ آپ کے لئے حرام ہوگئے اور وہ حرام مال آپ کی حلال آمدنی میں شامل ہوگئے اور آپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ یہ حرام مال شامل ہوگیا۔

زائد سامان کا کرایہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں یہ بات مشہور و معروف تھی کہ جب وہ ریل کا سفر کرتے تو اپنے سامان کا وزن ضرور کرایا کرتے تھے اور ایک مسافر کو جتنا سامان لے جانے کی اجازت ہوتی، اگر سامان اس وزن سے زیادہ ہوتا تو وہ زائد سامان کا کرایہ ریلوے کو ادا کرتے اور پھر سفر شروع کرتے۔ یہ کارروائی کئے بغیر سفر کرنے کا ان کے یہاں تصور ہی نہیں تھا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سفر

ایک مرتبہ خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک

مرتبہ سفر کرنے کے لئے اسٹیشن پہنچے اور سیدھے اس دفتر میں تشریف لے گئے جہاں سامان کا وزن کرایا جاتا تھا۔ وہاں اتفاق سے ریلوے کا گارڈ کھڑا ہوا تھا جو حضرت والا کو پہچانتا تھا، وہ پوچھنے لگا کہ حضرت کیسے تشریف لائے؟ حضرت نے فرمایا کہ میں اپنے سامان کا وزن کرانے آیا ہوں تاکہ اگر زیادہ ہو تو اس کا کرایہ ادا کردوں۔ اس گارڈ نے کہا کہ حضرت! آپ وزن کرانے کے چکر میں کیوں پڑ رہے ہیں، آپ سامان کو وزن کرائے بغیر سفر کرلیں، میں آپ کے ساتھ ہوں اور میں اس ٹرین کا گارڈ ہوں آپ کو راستے میں کوئی نہیں پکڑے گا اور اگر سامان زیادہ ہوا تو آپ سے کوئی شخص بھی جرمانے کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ حضرت نے اس گارڈ سے پوچھا کہ آپ کہاں تک میرے ساتھ جائیں گے؟ اس گارڈ نے جواب دیا کہ میں فلاں اسٹیشن تک جاؤں گا۔ حضرت والا نے پوچھا کہ اس کے بعد پھر کیا ہوگا؟ اس نے کہا کہ اس کے بعد جو گارڈ آئے گا، میں اس سے کہہ دوں گا کہ ان کے سامان کا ذرا خیال رکھنا۔ حضرت والا نے پھر پوچھا کہ وہ گارڈ کہاں تک جائے گا؟ گارڈ نے جواب دیا کہ وہ گارڈ تو جہاں تک آپ کی منزل ہے وہاں تک آپ کے ساتھ ہی سفر کرے گا، اس لئے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ مجھے اور بھی آگے جانا ہے۔ اس نے پوچھا کہ آگے کہاں جانا ہے؟ حضرت والا نے فرمایا کہ مجھے تو اس منزل سے آگے اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس جانا ہے، وہاں کون گارڈ میرے ساتھ جائے گا جو مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال و جواب سے بچائے گا؟

پھر حضرت والا نے فرمایا کہ یہ ٹرین تمہاری ملکیت نہیں ہے، اس کے اوپر تمہارا اختیار نہیں ہے، تمہیں محکمے کی طرف سے اجازت نہیں ہے کہ تم کسی شخص کے زیادہ سامان کو کرایہ کے بغیر چھوڑ دو۔ لہٰذا میں تمہاری وجہ سے دنیاوی پکڑ سے تو بچ جاؤں گا لیکن اس وقت جو چند پیسے میں بچالوں گا اور وہ چند پیسے میرے لئے حرام ہوجائیں گے، ان حرام پیسوں کے بارے میں جب اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال ہوگا تو وہاں پر کون سا گارڈ مجھے بچائے گا اور کون جواب دہی کرے گا؟ یہ باتیں سن کر اس

گارڈ کی آنکھیں کھل گئیں اور پھر حضرت والا سامان وزن کرا کر اس کے زائد پیسے ادا کر کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

یہ حرام پیسے رزق حلال میں شامل ہو گئے

لہٰذا اگر کسی نے اس طرح ریل گاڑی میں یا ہوائی جہاز میں سفر کے دوران اجازت سے زیادہ سامان کے ساتھ سفر کرلیا اور اس سامان کا وزن کرا کر اس کا کرایہ علیحدہ سے ادا نہیں کیا تو اس کے نتیجے میں جو پیسے بچے وہ حرام۔ بچے اور یہ حرام پیسے ہمارے رزقِ حلال کے اندر شامل ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا جو اچھا خاصا حلال پیسہ تھا اس میں حرام کی آمیزش ہو گئی۔

یہ بے برکتی کیوں نہ ہو

آج ہم لوگ جو بے برکتی کی وجہ سے پریشان ہیں اور ہر شخص رونا رو رہا ہے، جو لکھ پتی ہے وہ بھی رو رہا ہے اور جو کروڑ پتی ہے وہ بھی رو رہا ہے کہ صاحب خرچہ پورا نہیں ہوتا اور مسائل حل نہیں ہوتے، درحقیقت یہ بے برکتی اس لئے ہے کہ حلال و حرام کی تمیز اور اس کی فکر اٹھ گئی ہے۔ بس چند مخصوص چیزوں کے بارے میں تو یہ ذہن میں بٹھالیا ہے کہ یہ حرام ہیں، ان سے تو کسی نہ کسی طریقے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن مختلف ذرائع سے جو یہ حرام پیسے ہماری آمدنیوں میں داخل ہو رہے ہیں ان کی فکر نہیں۔

ٹیلیفون اور بجلی کی چوری

یا مثلاً ٹیلیفون کے محکمے والوں سے دوستی کرلی اور اب اس کے ذریعہ ملکی اور غیر ملکی کالیں ہو رہی ہیں، دنیا بھر میں باتیں ہو رہی ہیں اور ان کالوں پر ایک پیسہ ادا

نہیں کیا جارہا ہے۔ یہ درحقیقت محکمے کی چوری ہورہی ہے اور اس چوری کے نتیجے میں جو پیسے بچے وہ مال حرام ہے، اور وہ مال حرام ہمارے مال حلال کے اندر شامل ہورہا ہے۔ یا مثلاً بجلی کی چوری ہورہی ہے کہ بجلی کا میٹر بند پڑا ہے لیکن بجلی استعمال ہورہی ہے۔ اس طرح جو پیسے بچے وہ مال حرام ہے اور وہ حرام مال ہمارے حلال مال کے اندر شامل ہورہا ہے اور حرام مال کی آمیزش ہورہی ہے۔ لہٰذا نہ جانے کتنے شعبے ایسے ہیں جن میں ہم نے اپنے لئے حرام کے راستے کھول رکھے ہیں اور حرام مال ہمارے حلال مال میں داخل ہورہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بے برکتی کے عذاب کے اندر مبتلا ہیں۔

حلال و حرام کی فکر پیدا کریں

لہٰذا ہر کام کرتے وقت یہ دیکھو کہ جو کام میں کررہا ہوں یہ حق ہے یا ناحق ہے۔ اگر انسان اس فکر کے ساتھ زندگی گزارے کہ ناحق کوئی پیسہ اس کے مال کے اندر شامل نہ ہو تو یقین رکھئے پھر اگر ساری عمر نوافل نہ پڑھیں اور ذکر و تسبیح نہ کی لیکن اپنے آپ کو حرام سے بچا کر قبر تک لے گیا تو انشاء اللہ سیدھا جنت میں جائے گا۔ اور اگر حلال و حرام کی فکر تو نہیں کی مگر تہجد کی نماز بھی پڑھ رہا ہے، اشراق کی نماز بھی پڑھ رہا ہے، ذکر و تسبیح بھی کررہا ہے تو یہ نوافل اور یہ ذکر انسان کو حرام مال کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

یہاں تو آدمی بنائے جاتے ہیں

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ خانقاہوں میں ذکر و شغل سیکھنے کے لئے جاتے ہیں اگر ذکر و شغل سیکھنا ہے تو بہت ساری خانقاہیں کھلی ہیں وہاں چلا جائے، لیکن ہمارے یہاں تو آدمی بنانے کی کوشش

کی جاتی ہے اور شریعت کے جو احکام ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کی فکر پیدا کی جاتی ہے۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن پر اگر کوئی ڈاڑھی والا آدمی اپنا سامان وزن کرانے کے لئے بکنگ آفس پہنچتا تو وہ دفتر والے اس کو دیکھتے ہی پہچان لیتے کہ اس کا تعلق تھانہ بھون سے ہے، لہٰذا اس سے خود پوچھ لیتے کہ آپ تھانہ بھون جارہے ہیں؟

چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے اپنے تعلق رکھنے والوں میں سے کسی کے بارے میں یہ معلوم ہوجائے کہ اس کے معمولات چھوٹ گئے ہیں تو مجھے زیادہ دکھ اور شکایت نہیں ہوتی، لیکن اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم ہوجائے کہ اس نے حلال و حرام کو ایک کر رکھا ہے اور اس کو معاملات کے اندر حلال و حرام کی فکر نہیں ہے تو مجھے اس شخص سے نفرت ہوجاتی ہے۔

ایک خلیفہ کا سبق آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بڑے خلیفہ تھے جن کو آپ نے باقاعدہ خلافت عطا فرمائی تھی۔ ایک مرتبہ وہ ایک سفر سے تشریف لائے تو ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا، حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام دعا ہوئی، خیریت معلوم کی۔ حضرت والا نے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لارہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ فلاں جگہ سے آرہا ہوں۔ حضرت نے پوچھا کہ ریل گاڑی سے آرہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ حضرت نے پوچھا کہ یہ بچہ جو تمہارے ساتھ ہے اس کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا لیا تھا؟ اب آپ اندازہ لگائیں کہ خانقاہ کے اندر پیر صاحب اپنے مرید سے یہ سوال کررہے ہیں کہ بچے کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا لیا تھا؟ جبکہ دوسری خانقاہوں میں یہ سوال کرنے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ دوسری خانقاہوں میں تو یہ سوال ہوتا ہے کہ معمولات پورے کئے تھے یا نہیں؟ تہجد کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ اشراق کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ لیکن یہاں یہ سوال ہورہا ہے کہ یہ بچہ جو آپ کے ساتھ ہے اس کا ٹکٹ آدھا لیا تھا یا پورا لیا تھا؟ انہوں نے

جواب دیا کہ حضرت! آدھا لیا تھا۔ حضرت نے پھر سوال کیا کہ اس بچے کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت! یہ بچہ ویسے تو تیرہ سال کا ہے لیکن دیکھنے میں بارہ سال کا لگتا ہے اس لئے آدھا ٹکٹ لیا تھا۔ یہ جواب سن کر حضرت والا کو سخت رنج ہوا اور ان سے خلافت واپس لے لی اور فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوئی، تم اس لائق نہیں ہو کہ تمہیں خلافت دی جائے اور تمہیں مجاز بنایا جائے، اس لئے کہ تمہیں حلال و حرام کی فکر نہیں، جب بچے کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہوگئی، چاہے ایک دن ہی زیادہ کیوں نہ ہوئی ہو تو اس وقت تم پر واجب تھا کہ تم بچے کا پورا ٹکٹ لیتے۔ تم نے آدھا ٹکٹ لے کر جو پیسے بچائے وہ حرام کے پیسے بچائے اور جس کو حرام سے بچنے کی فکر نہ ہو وہ خلیفہ بننے کا اہل نہیں۔ چنانچہ خلافت واپس لے لی۔

اگر کوئی شخص حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے آکر کہتا کہ حضرت معمولات ترک ہوگئے۔ تو حضرت والا فرماتے کہ معمولات ترک ہوگئے تو استغفار کرو اور دوبارہ شروع کردو اور ہمت سے کام لو اور اس بات کا دوبارہ عزم کرو کہ آئندہ ترک نہیں کریں گے۔ اور معمولات ترک کرنے کی بناء پر کبھی خلافت واپس نہیں لی لیکن حلال و حرام کی فکر نہ کرنے پر خلافت واپس لے لی، اس لئے کہ جب حلال و حرام کی فکر نہ ہو تو وہ انسان انسان نہیں۔ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طلب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ حلال کی طلب دوسرے فرائض کے بعد یہ بھی فرض ہے۔

حرام مال حلال مال کو بھی تباہ کردیتا ہے

لہٰذا ہم میں سے ہر شخص اپنا جائزہ لے کہ جو پیسے اس کے پاس آرہے ہیں اور جو کام وہ کررہا ہے، ان میں کہیں حرام مال کی آمیزش تو نہیں ہے۔ حرام مال کی آمیزش کی چند مثالیں میں نے آپ کے سامنے سمجھانے کے لئے پیش کردیں۔ ورنہ نہ جانے کتنے کام ایسے ہیں جن کے ذریعہ نادانستہ طور پر اور غیر شعوری طور پر ہمارے

حلال مال میں حرام مال کی آمیزش ہوجاتی ہے۔ اور بزرگوں کا مقولہ ہے کہ جب کبھی کسی حلال مال کے ساتھ حرام مال لگ جاتا ہے تو وہ حرام حلال کو بھی تباہ کر کے چھوڑتا ہے، یعنی اس حرام مال کے شامل ہونے کے نتیجے میں حلال مال کی برکت، اس کا سکون اور راحت تباہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے ہر شخص اس کی فکر کرے اور ہر شخص اپنے ایک ایک عمل کا جائزہ لے اور اپنی آمدنی کا جائزہ لے کہ ہمارے حلال مال میں کہیں کوئی حرام مال تو شامل نہیں ہورہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس فکر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

رزق کی طلب مقصود زندگی نہیں

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس حدیث نے جہاں ایک طرف رزقِ حلال کی اہمیت بتائی کہ رزقِ حلال کی طلب دین سے خارج کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے، وہاں اس حدیث نے ہمیں رزق حلال کی طلب کا درجہ بھی بتادیا کہ اس کا کتنا درجہ اور کتنی اہمیت ہے۔ آج کی دنیا نے معاش کو، معیشت کو اور روپے پیسے کمانے کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی قرار دے رکھا ہے، آج ہماری ساری دوڑ دھوپ اسی کے گرد گھوم رہی ہے کہ پیسہ کس طرح حاصل ہو، کس طرح پیسوں میں اضافہ کیا جائے اور کس طرح اپنی معیشت کو ترقی دی جائے، اور اسی کو ہم نے اپنی زندگی کی آخری منزل قرار دے رکھا ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بتادیا کہ رزقِ حلال کی طلب فریضہ تو ہے لیکن دوسرے فرائض دینیہ کے بعد اس کا درجہ آتا ہے، یہ انسان کی زندگی کا مقصد اصلی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ضرورت ہے اور اس ضرورت کے تحت انسان کو نہ صرف یہ کہ رزقِ حلال کے طلب کی اجازت دی گئی ہے بلکہ اس کی ترغیب اور تاکید کی گئی ہے کہ تم رزق حلال طلب کرو، لیکن یہ رزق حلال کی طلب تمہارا مقصد زندگی نہیں ہے بلکہ مقصد زندگی کچھ اور ہے، اور وہ اللہ جلّ جلالہ کے ساتھ تعلّق قائم کرنا، اللہ تعالیٰ کی بندگی اور

عبادت کرنا ہے۔ یہ انسان کا اصل مقصد زندگی ہے اور معیشت کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

رزق کی طلب میں فرائض کا ترک جائز نہیں

لہٰذا جس جگہ پر معیشت میں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض کے درمیان ٹکراؤ ہو جائے، وہاں پر اللہ تعالیٰ کے عائد کئے ہوئے فرائض کو ترجیح ہوگی۔ بعض لوگ افراط کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں، جب انہوں نے یہ سنا کہ طلب حلال بھی دین کا ایک حصّہ ہے تو اس کو اتنا آگے بڑھایا کہ اس طلب حلال کے نتیجے میں اگر نمازیں ضائع ہو رہی ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، روزے چھوٹ رہے ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، حلال و حرام ایک ہو رہا ہے تو ان کو اس کی پرواہ نہیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ نماز پڑھو تو جواب دیتے ہیں کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں یہ بھی تو دین کا ایک حصّہ ہے، ہمارے دین میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے، لہٰذا جو کام ہم کر رہے ہیں یہ بھی دین کا ایک حصّہ ہے۔

ایک ڈاکٹر صاحب کا استدلال

کچھ عرصہ پہلے ایک خاتون نے مجھے بتایا کہ ان کے شوہر ڈاکٹر ہیں، وہ مطب کے اوقات میں نماز نہیں پڑھتے اور جب مطب بند کر کے گھر واپس آتے ہیں تو گھر آکر تینوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے ہیں۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ آپ نماز کو قضا کر دیتے ہیں یہ اچھا نہیں ہے، آپ وقت پر نماز پڑھ لیا کریں، تو جواب میں شوہر کہتے ہیں کہ اسلام نے خدمت خلق سکھائی ہے اور یہ ڈاکٹری اور مطب جو کر رہے ہیں یہ بھی خدمت خلق کر رہے ہیں اور یہ بھی دین کا ایک حصّہ ہے، اب اگر ہم نے خدمت خلق کی خاطر نماز کو چھوڑ دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اب دیکھئے! حلال کمانے کے لئے انہوں نے اوّلین دینی فریضے کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

یہ فرمارہے ہیں کہ طلب الحلال فریضة بعد الفریضة یہ فریضہ تو ہے لیکن بعد الفرائض ہے۔ لہٰذا اگر کسب معاش کے فریضے میں اور اوّلین دینی فرائض کے درمیان ٹکراؤ ہوجائے تو اس وقت دینی فریضہ غالب رہے گا۔

ایک لوہار کا قصّہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے ولی اللہ، فقیہ اور محدّث اور صوفی تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے درجات عطا فرمائے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ جواب میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم فرمایا اور بہت کچھ نوازشیں فرمائیں، لیکن میرے گھر کے سامنے ایک لوہار رہتا تھا، اس لوہار کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام بخشا وہ ہمیں نصیب نہ ہوسکا۔ جب اس شخص کی آنکھ کھلی تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ پتہ کرنا چاہئے کہ وہ کون لوہار تھا اور وہ کیا عمل کرتا تھا کہ اس کا درجہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا۔ چنانچہ وہ شخص حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے محلّے میں گیا اور معلومات کیں تو پتہ چلا کہ واقعۃً ان کے گھر کے سامنے ایک لوہار رہتا تھا اور اس کا بھی انتقال ہوچکا ہے۔ اس کے گھر جاکر اس کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارا شوہر کیا کام کرتا تھا؟ اس نے بتایا کہ وہ تو لوہار تھا اور سارا دن لوہا کوٹتا رہتا تھا۔ اس شخص نے کہا کہ اس کا کوئی خاص عمل اور خاص نیکی بتاؤ جو وہ کیا کرتا تھا، اس لئے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ اس کا مقام ہم سے بھی آگے بڑھ گیا۔

تہجد نہ پڑھنے کی حسرت

اس کی بیوی نے کہا کہ وہ سارا دن تو لوہا کوٹتا رہتا تھا، لیکن ایک بات اس کے اندر یہ تھی کہ چونکہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہمارے گھر کے سامنے رہتے تھے، رات کو جس وقت وہ تہجد کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے گھر کی چھت پر اس طرح کھڑے ہوجاتے جس طرح کوئی لکڑی کھڑی ہوتی ہے اور کوئی حرکت نہیں کرتے تھے۔ جب میرا شوہر ان کو دیکھتا تو یہ کہا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فراغت عطا فرمائی ہوئی ہے یہ ساری رات کیسی عبادت کرتے ہیں، ان کو دیکھ کر رشک آتا ہے، اگر ہمیں بھی اپنے مشغلے سے فراغت نصیب ہوتی تو ہمیں بھی اسی طرح تہجد پڑھنے کی توفیق ہوجاتی۔ چنانچہ وہ حسرت کیا کرتا تھا کہ میں چونکہ دن بھر لوہا کوٹتا ہوں، پھر رات کو تھک کر سو جاتا ہوں، اس لئے اس طرح تہجد پڑھنے کی نوبت نہیں آتی۔

نماز کے وقت کام بند

دوسری بات اس کے اندر یہ تھی کہ جب وہ لوہا کوٹ رہا ہوتا تھا اور اس وقت اس کے کان میں آذان کی آواز "اللہ اکبر" آجاتی، تو اگر اس وقت اس نے اپنا ہتھوڑا سر سے اونچا ہاتھ میں اٹھایا ہوا ہوتا تو اس وقت یہ گوارہ نہ کرتا تھا کہ اس ہتھوڑے سے ایک مرتبہ اور لوہے پر مار دے، بلکہ اس ہتھوڑے کو پیچھے کی طرف پھینک دیتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ اب آذان کی آواز سننے کے بعد اس ہتھوڑے سے ضرب لگانا میرے لئے درست نہیں، پھر نماز کے لئے مسجد کی طرف چلا جاتا تھا۔ جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا اس نے یہ باتیں سن کر کہا کہ بس یہی وجہ ہے جس نے ان کا مرتبہ اتنا بلند کردیا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ان پر رشک آرہا ہے۔

ٹکراؤ کے وقت یہ فریضہ چھوڑ دو

آپ نے دیکھا کہ وہ لوہار جو لوہا کوٹنے کا کام کر رہا تھا، یہ بھی کسب حلال کا فریضہ تھا اور جب آذان کی آواز آئی تو وہ اوّلین فریضے کی پکار تھی، جس وقت دونوں میں ٹکراؤ ہوا تو اس نے اللہ والے اور اوّلین فریضے کو ترجیح دی اور دوسرے فریضے کو چھوڑ دیا، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بلند مقام عطا فرما دیا۔ لہٰذا جہاں ٹکراؤ ہو جائے وہاں اوّلین فریضے کو اختیار کرلو اور کسب حلال کے فریضے کو چھوڑ دو۔

ایک جامع دعا

اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی۔

﴿اللھم لا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا ولا غایۃ رغبتنا﴾ (ترمذی، دعوات، حدیث نمبر ۳۵۶۹)

اے اللہ! ہمارا سب سے بڑا غم دنیا کو نہ بنائیے کہ ہمارے دماغ پر سب سے بڑا غم دنیا کا مسلّط ہو کہ پیسے کہاں سے آئیں، بنگلہ کیسے بن جائے اور کار کیسے حاصل ہو جائے۔ اور اے اللہ! ہمارے سارے علم کا مبلغ دنیا کو نہ بنائیے کہ جو کچھ علم ہے وہ بس دنیا کا علم ہے۔ اور اے اللہ! نہ ہماری رغبت کی انتہا دنیا کو بنائیے کہ جو کچھ دل میں رغبت پیدا ہو وہ دنیا ہی کی ہو اور آخرت کی رغبت پیدا نہ ہو۔

بہرحال، اس حدیث نے تیسرا سبق یہ دے دیا کہ کسب حلال کا درجہ دوسرے فرائض دینیہ کے بعد ہے۔ یہ دنیا ضرورت کی چیز تو ہے لیکن مقصد بنانے کی چیز نہیں ہے۔ یہ دنیا انہماک کی چیز نہیں ہے کہ دن رات آدمی اسی دنیا کی فکر میں منہمک رہے اور اس کے علاوہ کوئی اور فکر اور دھیان انسان کے دماغ پر نہ رہے۔

خلاصہ تین سبق

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے تین سبق معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ طلب

حلال بھی دین کا ایک حصّہ ہے۔ دوسرا یہ کہ انسان طلب حلال کی کرے اور حرام سے بچنے کی فکر کرے۔ اور تیسرا یہ کہ انسان اس معیشت کی سرگرمی کو صحیح مقام پر رکھے اور اس کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائے۔ اس لئے کہ اوّلین فرائض دینیہ کے بعد یہ دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

گناہ کی تہمت سے بچیے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گناہ کی تہمت سے بچئے

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات أعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضلّ لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد أن لا الٰہ إلا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہٗ ونشھد أن سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہٗ، صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ وأصحابہ وبارک وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیراً۔

امابعد!

﴿عن علی بن حسین رضی اللّٰہ عنھما، ان صفیۃ زوج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اخبرتہ أنھا جاءت الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم تزورہ فی اعتکافہٖ فی المسجد فی العشر الاواخر من رمضان۔ الخ﴾

(صحیح بخاری، کتاب الاعتکاف، باب ھل یخرج المعتکف لحوائجہ الی باب المسجد)

خلاصہ حدیث

یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک واقعہ کا بیان ہے۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان المبارک میں مسجد نبوی میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ اعتکاف میں تھے کہ اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ سے ملنے کے لئے اعتکاف کی جگہ پر تشریف لائیں، چونکہ اعتکاف کی وجہ سے آپ گھر کے اندر تشریف نہیں لے جاسکتے تھے، اس لئے وہ خود ہی ملاقات کے لئے آئیں، اور جتنی دیر ان کو بیٹھنا تھا، اتنی دیر تک بیٹھی رہیں۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کو رخصت کرنے کے لئے مسجد کے دروازے تک تشریف لائے۔

بیوی کا شوہر سے ملاقات کرنے کیلئے مسجد میں آنا

اب آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں دیکھتے جائیں۔ پہلی بات تو اس سے یہ معلوم ہوئی کہ اگر بیوی پردے کے ساتھ شوہر سے ملاقات کے لئے معتکف میں آجائے تو یہ جائز ہے۔

بیوی کا اکرام کرنا چاہئے

دوسری بات یہ سامنے آئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انہیں معتکف ہی سے رخصت کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ ان کو پہنچانے کے لئے مسجد کے دروازے تک تشریف لائے، ان کا اکرام کیا۔ اس عمل سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دیدی کہ بیوی کے ساتھ ایسا معاملہ اور سلوک کرنا چاہئے

جو برابری کی بنیاد کا ہو، اس کا اکرام کرنا اس کا حق ہے، جب وہ تم سے ملنے کے لئے آئی ہے، اور اب تم اس کو پہنچانے کے لئے جارہے ہو تو یہ پہنچانا بھی اس کے حقوق میں داخل ہے۔

دوسروں کے خدشات کو وضاحت کرکے دور کردینا چاہئے

بہر حال، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پہنچانے کے لئے دروازے کی طرف جانے لگے تو آپ نے دیکھا کہ دو حضرات صحابہ کرام آپ کے پاس ملنے کے لئے وہاں آرہے ہیں۔ آپ نے سوچا کہ کہیں ان دونوں حضرات کے قریب آنے سے اُمّ المؤمنین کی بے پردگی نہ ہو، اس لئے آپ نے ان دونوں حضرات سے فرمایا کہ ذرا وہیں ٹھہر جاؤ۔ یہ حکم اس لئے دیا تاکہ جب حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا پردے کے ساتھ اپنے گھر واپس چلی جائیں تو پھر ان حضرات کو بلالیا جائے۔ چنانچہ اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا وہاں سے گزر کر اپنے گھر تشریف لے گئیں، پھر آپ نے ان دو حضرات سے فرمایا کہ اب آپ تشریف لے آئیں۔ جب وہ آگئے تو آپ نے ان دنوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ خاتون حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں، یعنی میری بیوی تھیں۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے ان سے فرمایا کہ یہ صراحت میں نے اس لئے کردی کہ کہیں شیطان تمہارے دل میں کوئی بُرائی نہ ڈال دے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جب ان حضرات نے یہ دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاتون کے ساتھ مسجد نبوی میں جارہے ہیں، تو کہیں ان حضرات کے دل میں یہ وسوسہ نہ آجائے کہ یہ خاتون کون تھیں؟ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے کیوں آئی تھیں؟ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت سے فرمادیا کہ یہ "صفیہ" (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) تھیں، جو میری بیوی ہیں۔ یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔

اپنے کو مواقع تہمت سے بچاؤ

اس حدیث کی تشریح میں علماء کرام نے فرمایا کہ کیا کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ کسی صحابی کے دل میں حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس قسم کا کوئی غلط خیال آئے گا کہ آپ اس طرح کسی نامحرم خاتون کے ساتھ تشریف لے جارہے ہوں گے؟ اور پھر رمضان کا مہینہ، اور رمضان کا بھی عشرہ اخیرہ، اور پھر جگہ بھی مسجد نبوی، اور پھر اعتکاف کی حالت۔ کسی عام مسلمان کے بارے میں بھی یہ خیال آنا مشکل ہے، چہ جائیکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں۔

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کے ذریعہ اُمت کو یہ تعلیم دیدی کہ اپنے آپ کو تہمت کے مواقع سے بچاؤ، اگر کسی موقع پر اس بات کا اندیشہ ہو کہ کہیں کوئی تہمت نہ لگ جائے، یا کسی کے دل میں میرے بارے میں غلط خیال نہ آجائے تو ایسے مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ۔ حدیث کے طور پر ایک جملہ نقل کیا جاتا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ:

"اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهم" یعنی تہمت کے مواقع سے بچو۔ اگرچہ اس جملہ کی نسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، لیکن اس جملہ کی اصل یہ واقعہ ہے۔ لہٰذا جس طرح انسان کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ وہ گناہ سے بچے، ناجائز کاموں سے بچے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہ کی تہمت سے بھی بچائے، ناجائز کام کی تہمت سے بچائے، کوئی ایسا کام نہ کرے جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال ہو کہ شاید یہ فلاں گناہ کے کام میں مبتلا ہے۔

مواقع تہمت سے بچنے کے دو فائدے

تہمت کے مواقع سے اپنے آپ کو بچانے کے دو فائدے ہیں:

ایک فائدہ تو یہ ہے کہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں بدگمان کیوں کیا جائے؟ کیونکہ جس طرح دوسرں کا حق ہے، اپنے نفس کا بھی حق ہے۔ اور نفس کا حق یہ ہے کہ اس کو بلاوجہ ذلیل نہ کیا جائے، بلاوجہ اس کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں بدگمانی نہ پیدا کی جائے۔

دوسرا فائدہ دیکھنے والے شخص کا ہے، اس لئے کہ جو شخص تمہیں دیکھ کر بدگمانی میں مبتلا ہوگا، اور تحقیق کے بغیر تمہارے بارے میں بدگمانی کرے گا تو وہ بدگمانی کے گناہ میں مبتلا ہوگا، لہٰذا اس کو گناہ میں کیوں مبتلا کرتے ہو؟ بہرحال ایسا کام کرنا جس سے خواہ مخواہ لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوں، یہ درست نہیں۔

گناہ کے مواقع سے بھی بچنا چاہئے

گناہ کے جو مواقع ہوتے ہیں، وہاں جاکر آپ چاہے گناہ نہ کریں، لیکن گناہ کے ان مواقع کے پاس سے گزرنا، اور اس طرح گزرنا کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ یہ شخص بھی اس گناہ میں مبتلا ہوگا، یہ بھی درست نہیں۔ مثلاً کوئی سینما ہال ہے، اب آپ اس سینما ہال کے اندر سے یہ سوچ کر گزر گئے کہ چلو یہ راستہ مختصر ہے، یہاں سے نکل جائیں۔ اب آپ نے وہاں نہ تو کسی تصویر کو دیکھا اور نہ کوئی اور گناہ کیا، لیکن جو شخص بھی آپ کو گزرتے ہوتے دیکھے گا تو وہ یہی سمجھے گا کہ آپ سینما دیکھنے آئے ہوں گے، اس لئے کہ آپ نے ایسا کام کرلیا جس کی وجہ سے خواہ مخواہ آپ پر تہمت لگ گئی اور شبہ پیدا ہوگیا، ایسا کام کرنا بھی درست نہیں۔ اور اگر کبھی ایسی نوبت آجائے جس سے شبہ پیدا ہو تو وضاحت کرکے بتا دینا چاہئے کہ میں یہاں فلاں

مقصد سے آیا تھا۔ جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا کہ یہ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت

یہ بڑا نازک معاملہ ہے، ایک طرف تو اپنے آپ کو جان بوجھ کر "متّقی" ظاہر کرنا، یہ بھی شرعاً پسندیدہ نہیں۔ دوسری طرف بلاوجہ اپنے آپ کو گناہ گار ظاہر کرنا، یہ بھی پسندیدہ نہیں، اور نہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے، بلکہ آپ کی سُنّت یہ ہے کہ اپنے آپ کو تہمت سے بچاؤ۔

"ملامتی" فرقہ کا اندازِ زندگی

ایک فرقہ گزرا ہے جو اپنے آپ کو "ملامتی" کہتا تھا، اور پھر اسی "ملامتی فرقہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ فرقہ اپنی ظاہری حالت گناہ گاروں، فاسقوں اور فاجروں جیسی رکھتا تھا، مثلاً وہ نہ تو مسجد میں جاکر نماز پڑھتے تھے، اور نہ ہی کسی کے سامنے ذکر و عبادت کرتے تھے، اپنا حلیہ بھی فاسقوں جیسا بناتے تھے، ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اپنا حلیہ اس لئے ایسا بنادیتے ہیں تاکہ ریاکاری نہ ہوجائے، دکھاوا نہ ہوجائے۔ اگر ہم ڈاڑھی رکھیں گے اور مسجد میں جاکر صف اوّل میں نماز پڑھیں گے تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ ہم بڑے بزرگ آدمی ہیں، لوگ ہماری عزت کریں گے، اور اس سے ہمارا دل خراب ہوگا، اور اس کے نتیجے میں ہمارے دلوں میں تکبّر پیدا ہوگا، اس لئے ہم مسجد میں نماز نہیں پڑھتے۔ یہ "ملامتی فرقہ" کہلاتا تھا۔ یہ نام اس لئے پڑگیا کہ یہ لوگ اپنی ظاہری حالت ایسی بناتے تھے کہ دوسرے لوگ ان پر ملامت کریں کہ یہ کیسے خراب لوگ ہیں۔ لیکن ان کا یہ طرز عمل اور طریقہ سُنّت کا طریقہ اور شریعت کا طریقہ نہیں تھا، اور نہ ہی یہ ہمارے بزرگانِ دین کا صحیح طریقہ تھا۔

ایک گناہ سے بچنے کے لئے دوسرا گناہ کرنا

یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ غلبۂ حال میں ایسا طرز اختیار کر گیا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معذور ہوگا، لیکن اس کا یہ طرز عمل قابل تقلید نہیں، کیونکہ یہ طرز عمل شرعاً درست نہیں۔ کیا آدمی اپنے آپ کو ریاکاری اور تکبّر سے بچانے کے لئے ایک دوسرے گناہ کا ارتکاب کرے؟ ریاکاری ایک گناہ ہے اور اس گناہ سے بچنے کے لئے ایک دوسرے گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے کہ مسجد میں نماز نہیں پڑھ رہا ہے۔ شرعاً یہ بالکل درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حرام کر دیا، بس وہ حرام ہو گئی۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں مسجد میں جا کر نماز نہیں پڑھتا، بلکہ گھر میں نماز پڑھتا ہوں، اس لئے کہ اگر مسجد میں صف اول میں نماز پڑھوں گا تو یہ دکھاوا ہو جائے گا، سب لوگ دیکھیں گے کہ یہ شخص صف اول میں نماز پڑھ رہا ہے۔ چنانچہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے ذہنوں میں یہ خیال آتا ہے۔

نماز مسجد میں ہی پڑھنی چاہئے

یاد رکھیئے! یہ سب شیطان کا دھوکہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ مسجد میں آکر نماز پڑھو، تو بس اب مسجد میں ہی آکر نماز پڑھنا ضروری ہے، اور یہ خیال کہ یہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنے سے ریاکاری اور دکھاوا ہو جائے گا، یہ سب شیطان کا دھوکہ ہے۔ اس خیال پر ہرگز عمل مت کرو اور مسجد میں آکر نماز پڑھو۔ اور اگر ریاکاری کا خیال آئے تو استغفار کر لو۔ "استغفر اللّٰہ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذنب واتوب الیہ"۔

فرائض کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ ان کو علانیہ ادا کیا جائے، البتہ نوافل گھر میں پڑھنے کی اجازت ہے۔ لیکن جہاں تک فرائض کا تعلّق ہے تو مردوں کو چاہئے کہ وہ مسجد میں جا کر جماعت سے ادا کریں۔ اور اس "ملامتی فرقہ" کی جو

بات بیان کی، اس کا شریعت سے اور قرآن و سُنّت سے کوئی تعلق نہیں، اور شرعاً وہ طریقہ جائز نہیں۔ صحیح طریقہ وہ ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا، وہ یہ کہ "تہمت کے مواقع سے بھی بچو۔"

اپنا عذر ظاہر کردیں

فرض کریں کہ آپ کسی شرعی عذر کی وجہ سے مسجد میں جماعت سے نماز نہیں پڑھ سکے، اس وقت آپ کے پاس کوئی مہمان ملنے آگیا، اور آپ کو خیال آیا کہ چونکہ اس مہمان نے یہ دیکھ لیا ہے کہ میں مسجد میں نماز میں شریک نہیں تھا، تو یہ مہمان میرے بارے میں یہ سمجھے گا کہ میں جماعت سے نماز نہیں پڑھتا، تو اس وقت اگر آپ اس مہمان کے سامنے جماعت سے نماز نہ پڑھنے کا عذر واضح کرکے بتادیں کہ فلاں عذر کی وجہ سے میں جماعت میں پہنچ نہیں سکا تھا، تو کوئی گناہ کی بات نہیں، بلکہ یہ موضع تہمت سے بچنے کی بات ہے۔ اس لئے کہ اس مہمان کے دل میں آپ کی طرف سے یہ تہمت آسکتی تھی کہ شاید یہ جان بوجھ کر جماعت کی نماز چھوڑ رہا ہے، اب آپ نے عذر بیان کرکے اس کا دل صاف کردیا۔ اس میں نہ ریاکاری ہے اور نہ دکھاوا ہے، بلکہ یہ تہمت سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔

اس حدیث کی تشریح حضرت تھانویؒ کی زبانی

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ ایسے شبہات کے مواقع سے بچنا چاہئے جن کی ظاہری صورت بعض منکرات کی صورت کے مشابہ ہو۔ یعنی ظاہری طور پر ایسا معلوم ہورہا ہے کہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہوگا، جیسے منکوحہ عورت کے پاس بیٹھنا اور اجنبیہ عورت کے پاس بیٹھنا

دونوں صورتاً مشابہ ہیں، ایسے مواقع پر احتیاط و مدافعت ضروری ہے۔ باقی جو امور ایسے نہ ہوں، ان کی فکر میں پڑنا یہ خوفِ ملامت ہے جس کے ترک پر مدح کی گئی ہے۔"

یعنی ظاہری اعتبار سے جو گناہ معلوم ہو رہے ہوں، ان کے شبہ سے اپنے آپ کو بچانا تو ضروری ہے، لیکن آدمی اپنے آپ کو ایسی باتوں سے مبرّا ظاہر کرنے کی کوشش کرے جو فی نفسہ درست ہیں، اور لوگوں کی ملامت کے خوف سے ان کی تاویل وتوجیہ کرے تو یہ بات پسندیدہ نہیں۔

کسی نیک کام کی تاویل کی ضرورت نہیں

مثلاً کسی شخص نے سُنّت کا کوئی کام کیا، لیکن وہ سُنّت کا کام ایسا ہے جس کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے، جیسے کسی نے ڈاڑھی رکھ لی، اور لوگ اس کو پسند نہیں کرتے، اب یہ شخص اس کی تاویل کرتا پھر رہا ہے تاکہ لوگ اس کو ملامت نہ کریں اور اس کی بُرائی نہ کریں۔ یاد رکھیئے! اس کی چنداں ضرورت نہیں، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے ایک سُنّت کا کام کیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں یہ کام کیا ہے تو اب لوگ تمہیں اچھا سمجھیں یا بُرا سمجھیں، لوگ تمہیں اس کام پر ملامت کریں یا تمہاری تعریف کریں، ان سب سے بے نیاز ہو کر تم اپنا کام کئے جاؤ، اگر وہ ملامت کرتے ہیں تو کرنے دو۔ وہ ملامت ایک مسلمان کے گلے کا ہار ہے، وہ اس کے لئے زینت ہے۔ اگر کوئی شخص اتباعِ سُنّت کی وجہ سے تمہیں ملامت کر رہا ہے، دین پر چلنے اور اللہ کے حکم کی اتباع کی وجہ سے ملامت کر رہا ہے، تو وہ ملامت قابلِ مبارک باد ہے، یہ انبیاء علیہم السلام کا ورثہ ہے جو تمہیں مل رہا ہے، اس سے مت گھبراؤ، اور اس کی وجہ سے اپنی براءت ظاہر مت کرو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ نکلا کہ اپنے آپ کو کسی گناہ کے شبہ سے بچانے کے لئے کسی دوسرے پر کوئی بات ظاہر کردینا کہ یہ بات اصل میں ایسی تھی، یہ عمل صرف یہ کہ ناجائز نہیں بلکہ یہ عمل پسندیدہ ہے، تاکہ اس کے دل میں تمہاری طرف سے بدگمانی پیدا نہ ہو۔ اس لئے کہ دوسرے کو بدگمانی سے بچانا بھی ایک مسلمان کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اور اپنی رحمت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات پر پوری طرح عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دَعْوانا اَنِ الحَمْدُ للّٰہِ رَبِّ العٰلمین

بڑے کا اکرام کیجئے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بڑے کا اکرام کیجئے

الحمد للّٰہ نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده اللّٰہ فلا مضلّ له ومن يضلله فلا هادی له، ونشهد أن لا اله إلا اللّٰہ وحده لاشريک لهٗ ونشهد أن سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسولهٗ، صلى اللّٰہ تعالٰى عليه وعلٰى اٰله وأصحابه وبارک وسلم تسليمًا كثيرًا كثيراً۔

امابعد!

﴿عن ابن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: "اذا اتاكم كريم قوم فاكرموه"﴾

(ابن ماجہ، کتاب الادب، باب اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ، حدیث نمبر ۳۷۱۲)

جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز مہمان آئے تو تم اس کا اکرام کرو۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی قوم کا سردار ہے یا صاحبِ منصب ہے، اور اس قوم کے اندر اس کو معزز سمجھا جاتا ہے، جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اس کا اکرام کرو۔

اکرام کا ایک انداز

ویسے تو شریعت میں ہر مسلمان کا اکرام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کوئی مسلمان بھائی تمہارے پاس آئے تو اس کا حق ہے کہ اس کا اکرام کیا جائے اور اس کی عزّت کی جائے۔ حدیث شریف میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر آپ کسی جگہ پر بیٹھے ہیں اور کوئی مسلمان تمہارے پاس ملنے آگیا تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہئے کہ اس کے آنے پر تم تھوڑی سی حرکت کرلو۔ یہ نہ ہو کہ ایک مسلمان بھائی تم سے ملنے کے لئے آیا

لیکن تم اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے، بلکہ بُت بنے بیٹھے رہے۔ یہ طریقہ اس کے اکرام کے خلاف ہے۔ لہٰذا کم از کم تھوڑی سی اپنی جگہ سے حرکت کرنی چاہئے تاکہ آنے والے کو یہ محسوس ہو کہ اس نے میرے آنے پر میری عزّت کی ہے اور میرا اکرام کیا ہے۔

اکرام کے لئے کھڑا ہوجانا

ایک طریقہ ہے دوسرے کے اکرام کے لئے کھڑا ہوجانا، مثلاً کوئی شخص آپ کے پاس آئے تو آپ اس کی عزّت اور اکرام کے لئے اپنی جگہ سے کھڑے ہوجائیں۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ جو شخص آنے والا ہے، اگر وہ اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ لوگ میرے اکرام اور میری عزّت کے لئے کھڑے ہوں، تو اس صورت میں کھڑا ہونا درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ خواہش اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ اس کے اندر تکبر اور بڑائی ہے، اور وہ دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے، اس لئے وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ میرے لئے کھڑے ہوں۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس کے لئے نہ کھڑے ہوں۔ لیکن اگر آنے والے شخص کے دل میں یہ خواہش نہیں ہے کہ لوگ میرے لئے کھڑے ہوں، اب آپ اس شخص کے علم یا اس کے تقویٰ یا اس کے منصب کی وجہ سے اس کا اکرام کرتے ہوئے اس کے لئے کھڑے ہوجائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، کوئی گناہ بھی نہیں، اور کھڑا ہونا واجب بھی نہیں۔

حدیث سے کھڑے ہونے کا ثبوت

خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر صحابہ کرام کو کھڑے ہونے کا حکم دیا، چنانچہ جب بنو قریظہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ نے بلایا اور وہ تشریف لائے تو آپ نے اس وقت بنو قریظہ کے حضرات سے فرمایا: ﴿قوموا السید کم﴾

یعنی تمہارے سردار آرہے ہیں، ان کے لئے تم کھڑے ہو جاؤ۔ لہٰذا ایسے موقع پر کھڑے ہونا جائز ہے۔ اگر کھڑے نہ ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن حدیث میں اس بات کی تاکید ضرور آئی ہے کہ کسی کے آنے پر یہ نہ ہو کہ آپ بت بنے بیٹھے رہیں اور اپنی جگہ پر حرکت بھی نہ کریں، اور نہ اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کریں۔ بلکہ آپ نے فرمایا کہ کم از کم اتنا تو کرلو کہ اپنی جگہ پر ذرا سی حرکت کرلو، تاکہ آنے والے کو یہ احساس ہو کہ میرا اکرام کیا ہے۔

مسلمان کا اکرام "ایمان" کا اکرام ہے

ایک مسلمان کا اکرام اور اس کی عزت درحقیقت اس "ایمان" کا اکرام ہے جو اس مسلمان کے دل میں ہے۔ جب ایک مسلمان کلمہ طیّبہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر ایمان رکھتا ہے، اور وہ ایمان اس کے دل میں ہے، تو اس کا تقاضہ اور اس کا حق یہ ہے کہ اس مسلمان کا اکرام کیا جائے، اگرچہ ظاہری حالت کے اعتبار سے وہ مسلمان تمہیں کمزور نظر آرہا ہو، اور اس کے اعمال اور اس کی ظاہری شکل و صورت پوری طرح دین کے مطابق نہ ہو، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اس کے دل میں جو ایمان اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، اس ایمان کا کیا مقام ہے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا ایمان کتنا مقبول ہے؟ محض ظاہری شکل و صورت سے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہر آنے والے مسلمان کا بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کا اکرام کرنا چاہئے۔

ایک نوجوان کا سبق آموز واقعہ

ایک مرتبہ میں دارالعلوم میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، اس وقت ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ اس نوجوان میں سر سے لے کر پاؤں تک ظاہری اعتبار سے اسلامی وضع قطع کی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی۔ مغربی لباس میں ملبوس تھا، اس کی ظاہری شکل دیکھ کر بالکل اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کے اندر بھی دینداری کی

کوئی بات موجود ہوگی۔ میرے پاس آکر کہنے لگا کہ میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ کیا مسئلہ ہے؟ وہ کہنے لگا کہ مسئلہ یہ ہے کہ میں "اکچوری" "ماہر شماریات" (Actuary) ہوں، (انشورنس کمپنیوں میں جو حسابات وغیرہ لگائے جاتے ہیں کہ کتنا "پریمیم" ہونا چاہئے اور انشورنس کی کتنی رقم ہونی چاہئے۔ اس قسم کے حسابات کے لئے "اکچوری" رکھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں پاکستان بھر میں کہیں بھی یہ علم نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ پھر اس نوجوان نے کہا کہ) میں نے یہ علم حاصل کرنے کے لئے "انگلینڈ" کا سفر کیا اور وہاں سے یہ حاصل کرکے آیا ہوں (اس وقت پورے پاکستان میں اس فن کو جاننے والے دو تین سے زیادہ نہیں تھے، اور جو شخص "ماہر شماریات" بن جاتا ہے وہ انشورنس کمپنی کے علاوہ کسی اور جگہ پر کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ بہرحال، اس نوجوان نے کہا کہ) اور میں نے یہاں آکر ایک انشورنس کمپنی میں ملازمت کرلی۔ اور چونکہ پاکستان بھر میں اس کے ماہر بہت کم تھے، اس لئے ان کی مانگ بھی بہت تھی، اور ان کی تنخواہ اور سہولتیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ اس لئے میری تنخواہ اور سہولتیں بھی بہت زیادہ ہیں، لہٰذا میں نے یہ ملازمت اختیار کرلی۔ جب یہ سب کچھ ہوگیا، تعلیم حاصل کرلی، ملازمت اختیار کرلی، تو اب مجھے کسی نے بتایا کہ یہ انشورنس کا کام حرام ہے، جائز نہیں۔ اب میں آپ سے اس کی تصدیق کرنے آیا ہوں کہ واقعۃً یہ حرام ہے یا حلال ہے؟

انشورنس کا ملازم کیا کرے؟

میں نے اس سے کہا کہ اس وقت انشورنس کی جتنی صورتیں رائج ہیں، ان میں کسی میں سود ہے، کسی میں جوا ہے، اس لئے وہ سب حرام ہیں۔ اور اس وجہ سے انشورنس کمپنی میں ملازمت بھی جائز نہیں۔ البتہ ہمارے بزرگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بینک میں یا انشورنس کمپنی میں ملازم ہو، تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے دوسرا حلال اور جائز ذریعہ معاش تلاش کرے، اور اہتمام اور کوشش کے ساتھ اس طرح

تلاش کرے جیسے ایک بے روزگار تلاش کرتا ہے، اور جب اس کو دوسرا حلال ذریعہ آمدنی مل جائے، تو اس وقت اس حرام ذریعہ کو چھوڑ دے۔ یہ بات ہمارے بزرگ اس لئے فرماتے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں کہ کس کے حالات کیسے ہوں، اب اگر کوئی شخص فوراً اس حرام ذریعہ کو چھوڑ دے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوجائے، پھر شیطان آکر اس کو یہ بہکادے کہ دیکھو تم دین پر عمل کرنے چلے تھے تو اس کے نتیجے میں تم پر یہ مصیبت آگئی۔ اس لئے ہمارے بزرگ فرماتے ہیں کہ اس حرام ملازمت کو فوراً مت چھوڑو، بلکہ دوسری جگہ ملازمت تلاش کرو، جب حلال روزگار مل جائے تو اس وقت اس کو چھوڑ دینا۔

میں مشورہ لینے نہیں آیا

میرا یہ جواب سن کر وہ نوجوان مجھ سے کہنے لگا کہ مولانا صاحب! میں آپ سے یہ مشورہ لینے نہیں آیا کہ ملازمت چھوڑدوں یا نہ چھوڑوں؟ میں آپ سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ یہ کام حلال ہے یا حرام ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ حلال اور حرام ہونے کے بارے میں بھی میں نے تمہیں بتادیا، اور ساتھ میں بزرگوں سے جو بات سنی تھی، وہ بھی آپ کو بتادی۔ اس نوجوان نے کہا کہ آپ مجھے اس کا مشورہ نہ دیں کہ میں ملازمت چھوڑوں یا نہ چھوڑوں۔ بس! آپ مجھے صاف اور دو ٹوک لفظوں میں یہ بتادیں کہ یہ ملازمت حلال ہے یا نہیں؟ میں نے کہا حرام ہے۔ اس نوجوان نے کہا کہ یہ بتائیں کہ اس کو "اللہ" نے حرام کیا ہے یا آپ نے حرام کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ نے حرام کیا ہے۔ اس نوجوان نے کہا کہ جس اللہ نے اس کو حرام کیا ہے وہ مجھے رزق سے محروم نہیں کرے گا۔ لہٰذا اب میں یہاں سے اس دفتر میں واپس نہیں جاؤں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تو وہ ایسا نہیں کرے گا کہ مجھ پر رزق کے دروازے بند کردے۔ لہٰذا میں آج ہی سے اس کو چھوڑتا ہوں۔

ظاہری شکل پر مت جاؤ

اب دیکھئے! ظاہری شکل و صورت سے دور دور تک پتہ نہیں لگتا تھا کہ اس اللہ کے بندے کے دل میں ایسا پختہ ایمان ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایسا پختہ بھروسہ ہوگا اور توکّل ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا پختہ توکّل عطا فرمایا تھا۔ اور واقعۃً اس نوجوان نے وہ ملازمت اسی دن چھوڑ دی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو خوب نوازا اور دوسرے حلال روزگار اس کو عطا فرمائے۔ وہ اب امریکہ میں ہے۔ آج تک اس نوجوان کی یہ بات میرے دل پر نقش ہے۔ بہرحال، کسی کی ظاہری حالت دیکھ کر ہم اس پر کیا حکم لگائیں، معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ایمان کی کیسی شمع روشن کی ہوئی ہے، اور اس کو اپنی ذات پر کیسا بھروسہ اور کیسا توکّل عطا فرمایا ہوا ہے۔ لہٰذا کسی بھی انسان کی تحقیر مت کرو، جو صاحب ایمان ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے "اشهد ان لا اله إلا اللّٰه، اشهد ان محمداً رسول اللّٰه" کی دولت عطا فرمائی ہے، وہ قابل اکرام ہے۔ اسی وجہ سے ہر صاحب ایمان کے اکرام کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہر بیشہ گمان مبر کہ خالی است
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

یعنی گمان مت کرو کہ ہر جنگل خالی ہوگا، پتہ نہیں کیسے کیسے شیر اور چیتے اس میں سوئے ہوئے ہوں گے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو ایمان کی دولت عطا فرمادیں تو اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس صاحب ایمان کی قدر کریں، اس کی عزّت کریں اور اس ایمان کا اکرام کریں جو اس کے دل میں ہے۔

معزّز کافر کا اکرام

ویسے تو ہر مسلمان کے اکرام کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اس حدیث میں یہاں تک

فرمایا کہ اگر آنے ولا کافر ہی کیوں نہ ہو، مگر وہ اپنی قوم میں معزز سمجھا جاتا ہے، اس کی عزت کی جاتی ہے، لوگ اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کو اپنا بڑا مانتے ہیں، چاہے وہ کافر اور غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اس کے آنے پر بھی تم اس کا اکرام کرو اور اس کی عزت کرو۔ یہ اسلامی اخلاق کا ایک تقاضہ ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔ یہ عزت اس کے کفر کی نہیں ہے، کیونکہ اس کے کفر سے تو نفرت اور کراہیت کا معاملہ کریں گے، لیکن چونکہ اس کو اپنی قوم میں باعزت سمجھا جاتا ہے، اس لئے جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اس کی مدارات کے لئے اس کا اکرام کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے نفرت کرنے کے نتیجے میں تم اس کے ساتھ ایسا برتاؤ اختیار کرلو کہ وہ تم سے اور تمہارے دین ہی سے متنفر ہوجائے، اس لئے اس کا اکرام کرو۔

کافروں کے ساتھ آپؐ کا طرز عمل

حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کر کے دکھایا۔ آپؐ کے پاس کافروں کے بڑے بڑے سردار آیا کرتے تھے، جب وہ سردار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تو ان کو کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہمارے ساتھ بے عزتی ہوئی ہے، بلکہ آپ نے ان کی عزت کی، ان کا اکرام کیا، ان کو عزت سے بٹھایا، اور عزت کے ساتھ ان سے بات کی۔ یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت کہ اگر کافر بھی ہمارے پاس آجائے تو اس کو بھی بے عزتی کا احساس نہ ہو۔

ایک کافر شخص کا واقعہ

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تشریف فرما تھے۔ سامنے سے ایک صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کے قریب تشریف فرما تھیں، آپ نے فرمایا اے عائشہ! یہ شخص جو سامنے سے آرہا ہے، یہ اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ پھر جب

وہ شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ نے کھڑے ہو کر اس کا اکرام کیا، اور بڑی عزّت کے ساتھ اس سے بات چیت کی۔ جب وہ شخص بات چیت کرنے کے بعد واپس چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے خود ہی تو فرمایا تھا کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے، لیکن جب یہ شخص آگیا تو آپ نے اس کی بڑی عزّت کی اور اس سے بڑی نرمی کے ساتھ پیش آئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وہ آدمی بہت بُرا ہے جس کے شر سے بچنے کے لئے اس کا اکرام کیا جائے۔

یہ غیبت جائز ہے

اس حدیث میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ شخص دور سے چلتا ہوا آرہا تھا تو اس کے آنے سے پہلے ہی اس کے پیٹھ پیچھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس کی بُرائی بیان کی کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو غیبت ہے، اس لئے کہ پیٹھ پیچھے ایک آدمی کی بُرائی بیان کی جارہی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں یہ غیبت نہیں، اس لئے کہ اگر کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کے شر سے بچانے کی نیت سے اس کی بُرائی بیان کی جائے تو یہ غیبت نہیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے کو متنبّہ کرنے کے لئے اس سے کہے کہ تم فلاں شخص سے ذرا محتاط رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں دھوکہ دے جائے، یا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں تکلیف پہنچائے۔ تو یہ غیبت میں داخل نہیں، حرام اور ناجائز نہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں یہ بتانا واجب ہوجاتا ہے۔ مثلاً آپ کو یقینی طور پر معلوم ہے کہ فلاں شخص فلاں آدمی کو دھوکہ دے گا، اور اس دھوکے کے نتیجے میں اس دوسرے شخص کو مالی یا جانی سخت تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ تو آپ پر واجب ہے کہ آپ اس دوسرے شخص کو بتادیں کہ دیکھو فلاں آدمی تمہیں دھوکہ دینا چاہتا ہے، تاکہ وہ

اس سے محفوظ رہے۔ یہ غیبت میں داخل نہیں۔

لہٰذا جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ بتایا کہ یہ شخص قبیلے کا بُرا آدمی ہے، تو اس بتانے کا منشا یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شخص حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کسی وقت دھوکہ دے جائے، یا کہیں اس شخص پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوئے خود حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا کوئی دوسرا مسلمان کوئی ایسا کام کر گزرے جس کی وجہ سے بعد میں انہیں پچھتاوا ہو۔ اس لئے آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس کے بارے میں پہلے سے بتادیا۔

بُرے آدمی کا آپ نے اکرام کیوں کیا؟

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آپ نے اس کی بُرائی بیان فرمائی، اور دوسری طرف جب وہ شخص آگیا تو آپ نے اس کی بڑی عزت فرمائی، اور بڑی خاطر تواضع فرمائی۔ اس میں ظاہر اور باطن میں فرق ہوگیا کہ سامنے کا معاملہ کچھ ہے، اور پیچھے کچھ اور ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جنہوں نے ایک ایک چیز کی حد بیان فرمائی ہے، لہٰذا متنبّہ کرنے کے لئے تو آپ نے اتنا بتادیا کہ یہ شخص بُرا آدمی ہے، لیکن جب وہ شخص ہمارے پاس مہمان بن کر آیا ہے تو مہمان ہونے کی حیثیت سے بھی اس کا کچھ حق ہے، وہ یہ کہ ہم اس کے ساتھ عزّت سے پیش آئیں، اور اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں جو ایک مہمان کے ساتھ کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی برتاؤ فرمایا۔

وہ آدمی بہت بُرا ہے

اس حدیث میں ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر بُرے آدمی کا اکرام نہ کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچادے، یا کسی مصیبت کے اندر مبتلا کردے، یا تمہارے ساتھ وہ کوئی ایسا معاملہ کردے جس

کے نتیجے میں تمہیں آئندہ پچھتانہ پڑے، اس لئے اگر کسی بُرے آدمی سے ملاقات کی نوبت آجائے تو اس کا اکرام کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے شر سے اپنی جان کو اور اپنے مال کو اور اپنی آبرو کو بچانا بھی انسان کے فرائض میں داخل ہے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں صاف صاف ارشاد فرمادیا کہ وہ آدمی بہت بُرا ہے جس کے شر سے بچنے کے لئے لوگ اس کا اکرام کریں۔ لوگ اس کا اکرام اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ وہ آدمی اچھا ہے، بلکہ اس لئے اس کا اکرام کر رہے ہیں کہ اگر اس کا اکرام نہیں کریں گے تو یہ تکلیف پہنچائے گا۔ ایسی صورت میں بھی اکرام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ وہ اکرام جائز حدود کے اندر ہو اور اس کی وجہ سے کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارکہ کے ایک ایک جز میں نہ جانے کتنے بے شمار سبق ہمارے اور آپ کے لئے موجود ہیں۔ آپ نے غیبت کی حد بتادی کہ اتنی بات غیبت ہے، اور اتنی بات غیبت میں داخل نہیں۔ اور اکرام کرنا کوئی منافقت نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ وہ آنے والا خواہ کیسا ہی کافر اور فاسق و فاجر ہو، لیکن جب وہ تمہارے پاس مہمان بن کر آئے تو اس کی عزّت کرو، اس کا اکرام کرو۔ کیونکہ یہ بات منافقت میں داخل نہیں۔

سرسیّد کا ایک واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سرسیّد کا یہ واقعہ سنا۔ اب تو وہ اللہ کے پاس چلے گئے، اب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی عقائد کے اندر جو گڑبڑ کی ہے، وہ بڑی خطرناک قسم کی ہے۔ مگر چونکہ ابتداءً وہ بزرگوں کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور باقاعدہ عالم بھی تھے، اس لئے ان کے اخلاق اچھے تھے۔ بہرحال، حضرت والد صاحبؒ نے ان کا یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، اور ان کے ساتھ کچھ بے تکلف دوست بھی تھے، سامنے دور سے ان کو ایک آدمی

آتا ہوا دکھائی دیا، وہ آنے والا عام ہندوستانی لباس پہنا ہوا چلا آرہا تھا، لیکن جب وہ کچھ قریب آگیا تو باہر ہی ایک حوض کے پاس آکر کھڑا ہوگیا، اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا، اس تھیلے میں سے اس نے ایک عربی جبہ نکالا، اور عرب لوگ سر پر رومال کے اوپر جو ڈوری باندھتے ہیں، وہ نکالی، اور ان دنوں کو پہنا، اور پھر قریب آنے لگا۔ سرسید صاحب دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، آپ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ یہ جو شخص آرہا ہے، یہ فراڈی آدمی معلوم ہورہا ہے، اس لئے کہ یہ شخص اب تک تو سیدھے سادھے ہندوستانی لباس میں آرہا تھا، یہاں قریب آکر اس نے اپنا چولہ بدل لیا ہے اور عربی لباس پہن لیا ہے، اب یہاں آکر یہ اپنے آپ کو عرب ظاہر کرے گا اور پھر پیسے وغیرہ مانگے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص ان کے پاس پہنچ گیا اور آکر دروازے پر دستک دی، سرسید صاحب نے جاکر دروازہ کھولا اور عزت کے ساتھ اس کو اندر بلالیا۔ سرسید نے پوچھا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوں۔ یہ حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے صوفیاء کرام میں سے تھے۔ اور پھر اس شخص نے کچھ اپنی ضرورت بیان کی کہ میں اس ضرورت سے آیا ہوں، آپ میری کچھ مدد کردیں۔ چنانچہ سرسید صاحب نے پہلے اس کی خوب خاطر تواضع کی، اور پھر جتنے پیسوں کی اس کو ضرورت تھی، اس سے زیادہ لاکر اس کو دیدیے۔ اور پھر بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کو رخصت کردیا۔

آپ نے اس کی خاطر مدارات کیوں کی؟

جب وہ شخص واپس چلا گیا تو ان کے ساتھی نے سرسید صاحب سے کہا کہ آپ بھی عجیب انسان ہیں، آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے اپنا چولہ بدلا اور اپنا عام لباس اتار کر عرب لباس پہنا، پھر آپ نے خود کہا کہ یہ فراڈی ہے، آکر دھوکہ دے گا اور پیسے مانگے گا، اس کے باوجود آپ نے اس کی اتنی خاطر مدارات کی اور

اس کو اتنے پیسے بھی دیئے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

سرسید صاحب نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ مہمان بن کر آیا تھا، اس لئے میں نے اس کی خاطر تواضع کی۔ جہاں تک پیسے دینے کا تعلق ہے، اس کے دھوکہ کی وجہ سے میں اس کو پیسے نہ دیتا، لیکن چونکہ اس نے ایک ایسے بڑے بزرگ کا نام لے لیا جس کے بعد میری جرأت نہیں ہوئی کہ میں انکار کروں، کیونکہ حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان اولیاء کرام میں سے ہیں کہ اگر اس شخص کو ان سے دور دراز کی بھی نسبت تھی، تو اس نسبت کا احترام کرنا میرا فرض تھا، شاید اللہ تعالیٰ میرے اس نسبت کے احترام پر میری مغفرت فرمادیں۔ اس لئے میں نے اس کو پیسے بھی دے دیئے۔

دین کی نسبت کا احترام

یہ واقعہ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا۔ اور انہوں نے یہ واقعہ اپنے شیخ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ایک طرف سرسید صاحب نے مہمان کا اکرام کیا، اور دوسری طرف بزرگانِ دین کی نسبت کا احترام کیا، کیونکہ جو شخص اللہ کا ولی ہے، اور اس کی طرف کسی شخص کو ذرا سی بھی نسبت ہوگئی ہے، اگر اس نسبت کا احترام کرلیا تو کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اس نسبت کے اکرام ہی کی بدولت نوازش فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔ بہرحال، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا کہ کسی بھی قوم کا معزز آدمی آئے تو اس کا اکرام کرو۔

عام جلسہ میں معزز کا اکرام

یہاں ایک بات اور عرض کردوں، وہ یہ کہ جو عام اجتماع گاہ یا مجلس یا مسجد ہوتی ہے، اس کا عام قائدہ یہ ہے کہ جو شخص مسجد میں یا کسی مجلس میں یا کسی اجتماع میں

جس جگہ جاکر پہلے بیٹھ جائے، وہی اس جگہ کا زیادہ حقدار ہے۔ مثلاً مسجد کی اگلی صف میں جاکر اگر کوئی شخص پہلے بیٹھ جائے، وہ اس کا زیادہ حقدار ہے، اب دوسرے شخص کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس سے کہے کہ بھائی! تم اس جگہ سے ہٹ جاؤ، یہاں میں بیٹھوں گا، بلکہ جس شخص کو جہاں جگہ مل جائے، وہ وہاں بیٹھ جائے۔ لیکن اگر اسی مجلس میں یا عام اجتماع میں یا مسجد میں کوئی ایسا شخص آجائے جو اپنی قوم کا معزز فرد ہے، تو اس کو آگے بٹھانا اور دوسروں سے آگے جگہ دیدینا بھی اس حدیث کے مفہوم میں داخل ہے۔ ہمارے بزرگوں کا معمول یہ ہے کہ جب کسی مجلس میں سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوں اور اس وقت کوئی معزز مہمان آجائے تو اس معزز مہمان کو اپنے قریب بٹھاتے ہیں، اور اگر اس کو قریب بٹھانے کے لئے دوسروں سے یہ بھی کہنا پڑے کہ تھوڑا سا پیچھے ہو جائیں، تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ حدیث پر عمل ہو رہا ہے

یہ بات اس لئے عرض کردی کہ اس طرز عمل پر ہمارے بزرگوں کا معمول رہا ہے، جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کا تو حکم یہ ہے کہ جو شخص پہلے آجائے، اس کو جہاں جگہ مل جائے، وہ وہاں بیٹھ جائے، اب اگر کوئی شخص دیر سے آیا ہے، اور اس کو پیچھے جگہ مل رہی ہے، تو اس کو چاہئے کہ وہ وہیں پیچھے بیٹھے، لیکن یہ بزرگ صاحب دوسرں کا حق پامال کرکے دیر سے آنے والے کو آگے کیوں بلا رہے ہیں؟۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ آگے بلانے والے بزرگ درحقیقت اس حدیث پر عمل فرماتے ہیں کہ "اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ" یعنی جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز آدمی آجائے تو تم اس کا اکرام کرو۔

بلکہ ہمارے بزرگ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین) وہ اس بات کا بڑا خیال فرماتے تھے، یہاں تک

کہ اگر کوئی بڑا آدمی مسجد میں آجاتا، اور اگلی صف کے لوگ اس کو جگہ نہ دیتے، تو حضرت والا اس طرز عمل پر لوگوں کو خاص طور پر متنبہ فرماتے کہ بھائی یہ کیا انداز ہے؟ تمہیں چاہیئے کہ اپنی جگہ سے ہٹ کر ایسے معزز آدمی کو جگہ دیں، اور اس کو یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ ناانصافی ہے، بلکہ یہ بھی اس حدیث کے ارشاد پر عمل کا ایک حصّہ ہے۔

معزّز کا اکرام باعثِ اجر ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر ایک جملہ یہ تحریر فرمایا ہے، وہ بھی یاد رکھنے کا ہے، وہ یہ کہ ”کوئی شخص کافر ہو یا فاسق ہو، اگر اس کے آنے پر اس کا اکرام اس حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے ہو تو انشاء اللہ باعثِ اجر ہے، کیوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل ہے۔ لیکن اگر اس کا اکرام اس نیت سے کرے کہ میں اگر اس کا اکرام کروں گا تو یہ فلاں موقع پر میرے کام آئے گا، یا فلاں موقع پر اس سے سفارش کراؤں گا، یا اس سے فلاں دنیاوی مقصد حاصل کروں گا، گویا کہ ایک فاسق یا کافر کے اکرام کا مقصد دنیاوی لالچ ہے اور اس سے پیسے بٹورنا مقصود ہے یا اپنے لئے کوئی منصب حاصل کرنا ہے، تو اس صورت میں یہ اکرام درست نہیں۔

لہٰذا اکرام کرتے وقت نیت درست ہونی چاہیئے، یعنی یہ نیت ہونی چاہیئے کہ چونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا ہے اس لئے اس حکم کی تعمیل میں یہ اکرام کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دَعْوانا اَنِ الحَمْدُ للّٰہِ رَبِّ العٰلمین

تعلیم قرآن کی اہمیت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۱۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تعلیم قرآن کی اہمیت

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات أعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضلَّ لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد أن لا الٰہ إلا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہٗ ونشھد أن سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہٗ، صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہ وأصحابہ وبارک وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیراً۔

امابعد!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ (البقرۃ:۱۲۱)

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔

(بخاری، فضائل القرآن، باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ)

آمنت باللّٰہ صدق اللّٰہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذلک من الشاھدین والشاکرین، والحمدللّٰہ ربِّ العٰلمین۔

تمہید

بزرگان محترم و برادران عزیز! آج ہم سب کے لئے یہ سعادت کا موقع ہے کہ

ایک دینی مدرسہ کی تأسیس کی تقریب میں شرکت کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ ایک ایسا مدرسہ جو قرآنِ کریم کی تعلیم اور تعلّم کے لئے قائم کیا جارہا ہے، اس کی پہلی اینٹ رکھنے میں ہم سب کو شرکت کا موقع مل رہا ہے، یہ انشاء اللہ سب کے لئے صدقہ جاریہ ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کے انوار و برکات ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین

آیت کی تشریح

موقع کی مناسبت سے میں نے قرآنِ کریم کی ایک آیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث تلاوت کی ہے، ان کی تھوڑی سی تشریح اس مختصر وقت میں کرنا چاہتا ہوں۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾

یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی۔ کتاب سے مراد ہے اللہ کی کتاب۔ وہ لوگ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں، وہی لوگ درحقیقت اس کتاب پر ایمان لانے والے ہیں۔ یعنی صرف زبانی طور پر کتاب پر ایمان لانے کا دعویٰ کافی نہیں، جب تک کہ اس کی تلاوت کا حق ادا نہ کیا جائے۔ اس آیت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس طرف متوجہ فرمایا کہ زبان سے تو ہر شخص یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اللہ کی کتاب پر ایمان لاتا ہوں، لیکن جب تک وہ اس کی تلاوت کا حق ادا نہ کرے، اس وقت تک وہ اپنے اس دعویٰ ایمان میں صحیح معنی میں سچا نہیں۔

قرآنِ کریم کے تین حقوق

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآنِ کریم کے کچھ حقوق اللہ تعالیٰ کی طرف

سے ہمارے اوپر مقرر فرمائے گئے ہیں۔ وہ تین حقوق ہیں: پہلا حق یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی صحیح طریقے سے اس طرح تلاوت کرنا جس طرح وہ نازل ہوا اور جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلاوت فرمائی۔ دوسرا حق یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور اس کے حقائق اور معارف کو اپنے دل میں اتارنا۔ تیسرا حق یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات اور ہدایات پر عمل کرنا۔ اگر قرآنِ کریم کے یہ تین حقوق کوئی شخص ادا کرے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے قرآنِ کریم کا حق ادا کردیا، لیکن اگر ان تین میں سے کسی ایک حق کی ادائیگی نہ کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کا حق ادا نہیں کیا۔

تلاوتِ قرآن خود مقصود ہے

سب سے پہلا حق ہے صحیح طریقے پر تلاوت کرنا۔ آج کل لوگوں میں پروپیگنڈا کیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کو طوطا مینا کی طرح رٹنے سے کیا فائدہ، جب تک کہ انسان اس کے معنیٰ اور مطلب نہ سمجھے اور جب تک اس کے مفہوم کا اس کو ادراک نہ ہو، **اس** طرح بچوں کو قرآنِ کریم رٹانے سے کیا حاصل ہے؟ (العیاذ باللہ) یاد رکھئے! یہ شیطان کی طرف سے بہت بڑا دھوکہ اور فریب ہے جو مسلمانوں کے اندر پھیلایا جارہا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جن مقاصد کے لئے بھیجا گیا، قرآنِ کریم نے ان کو متعدد مقامات پر بیان فرمایا، ان مقاصد میں دو چیزوں کو علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا۔ ایک طرف فرمایا:

﴿يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ﴾

اور دوسری طرف فرمایا:

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے تشریف لائے تاکہ کتاب اللہ کی آیات

لوگوں کے سامنے تلاوت کریں۔ لہٰذا تلاوت کرنا ایک مستقل مقصد ہے اور ایک مستقل نیکی اور اجر کا کام ہے، چاہے سمجھ کر تلاوت کرے یا بے سمجھے تلاوت کرے۔ اور یہ تلاوت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے جس کو سب سے پہلے ذکر فرمایا:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾

قرآنِ کریم اور فنِ تجوید

اور قرآنِ کریم کی تلاوت ایسی بے وقعت چیز نہیں کہ جس طرح چاہا تلاوت کرلیا، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ کو باقاعدہ تلاوت کرنے کا طریقہ سکھایا اور اس کی تعلیم دی کہ کس لفظ کو کس طرح ادا کرنا ہے، کس طرح زبان سے نکالنا ہے۔ اس کی بنیاد پر دو مستقل علوم وجود میں آئے، جن کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں نہیں ہے۔ ایک علم تجوید، دوسرا علم قرأت۔ علمِ تجوید یہ سکھاتا ہے کہ قرآنِ کریم کو پڑھنے کے لئے کس حرف کو کس طرح نکالا جائے گا اور کس حرف کو نکالنے کے لئے کن باتوں کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے، اور اس علم کے اندر وہ طریقہ بتایا گیا ہے۔ جس طریقے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم پڑھا۔ اور اس علم پر بے شمار کتابیں موجود ہیں جس میں علماء کرام نے محنت کر کے اس علم کو مرتب کیا ہے۔ اس علم کی نظیر دنیا کی کسی دوسری قوم کے پاس نہیں ہے کہ الفاظ کی ادائیگی کے لئے کیا کیا طریقے ہوتے ہیں اور کس طرح الفاظ کو زبان سے نکالا جاتا ہے۔ یہ صرف اُمتِ مسلمہ کی خصوصیت ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ اور یہ علم آج تک اس طرح محفوظ ہے کہ آج پورے اطمینان کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح قرآنِ کریم پڑھا تھا اور جس طرح آپ پر قرآنِ کریم نازل کیا گیا تھا، الحمدللہ، اسی شکل و صورت میں وہ قرآنِ کریم آج بھی محفوظ ہے، کوئی شخص اس

کے اندر کسی قسم کی تبدیلی نہیں لا سکا۔

قرآنِ کریم اور علمِ قرآت

دوسرا قرأت کا علم ہے۔ وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم نازل فرمایا تو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ کریم پڑھنے کے کئی طریقے بھی نازل فرمادیئے گئے کہ اس لفظ کو اس طرح بھی پڑھا جاسکتا ہے اور اس طرح بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ اس کو "علمِ قرآت" کہتے ہیں۔ اس علم کو بھی اُمتِ مسلمہ نے جوں کا توں محفوظ رکھا اور آج تک محفوظ چلا آرہا ہے۔

یہ پہلی سیڑھی ہے

بہرحال، تلاوت بذاتِ خود ایک مقصد ہے اور یہ کہنا کہ بغیر سمجھے صرف الفاظ کو پڑھنے سے کیا حاصل؟ یہ شیطان کا دھوکہ ہے۔ یاد رکھئے! جب تک کسی شخص کو قرآنِ کریم سمجھے بغیر پڑھنا نہ آیا تو وہ شخص دوسری منزل پر قدم رکھ ہی نہیں سکتا، قرآنِ کریم سمجھے بغیر پڑھنا پہلی سیڑھی ہے، اس سیڑھی کو پار کرنے کے بعد دوسری سیڑھی کا نمبر آتا ہے۔ اگر کسی شخص کو پہلی سیڑھی پار کرنے کی توفیق نہ ہوئی تو وہ دوسری سیڑھی تک کیسے پہنچے گا۔

ہر حرف پر دس نیکیاں

اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا ہے تو ہر حرف کی ادائیگی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اور پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے

اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ لہٰذا جس شخص نے "الٓمٓ" پڑھا تو اس کے نامۂ اعمال میں تیس نیکیوں کا اضافہ ہوگیا۔ اگرچہ بعض علماء نے تو اس حدیث کی تشریح میں یہ فرمایا کہ "الٓمٓ" پڑھنے پر نوّے نیکیاں لکھی جائیں گی، کیونکہ خود "الف" تین حرفوں پر مشتمل ہے اور "لام" بھی تین حرفوں پر مشتمل ہے اور "میم" بھی تین حرفوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح یہ نو حروف ہوئے اور ہر حرف پر دس نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے تو اس طرح نوّے نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں۔ اتنی فضیلت تلاوتِ قرآنِ کریم پر اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔

"نیکیاں" آخرت کی کرنسی

آج ہمارے دلوں میں نامۂ اعمال میں نیکیوں کے اضافے کی اہمیت اور اس کی قدر معلوم نہیں ہوتی، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہہ دیتا کہ یہ نیک کام کروگے تو تمہیں نوّے روپے ملیں گے تو اس کی ہمارے دلوں میں بڑی قدر و منزلت ہوتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آج ہمیں ان نیکیوں کی قدر معلوم نہیں لیکن یاد رکھئے! یہ نیکیاں ہی درحقیقت آخرت کی کرنسی ہیں، جب تک یہ ظاہری آنکھ کھلی ہوئی ہے، اور جب تک انسان کا سانس چل رہا ہے، اس وقت تک اس نیکی کا اجر و ثواب اور اس کا حقیقی فائدہ انسان کو معلوم نہیں ہوتا، لیکن جب یہ آنکھ بند ہوگی اور آخرت کا اور برزخ کا عالم شروع ہوگا تو اس وقت تم وہاں نہ تو پیسے ساتھ لے جاسکو گے اور نہ روپے ساتھ لے جاسکو گے، وہاں تو صرف یہ سوال ہوگا کہ کتنی نیکیاں اپنے اعمال نامے میں لے کر آئے ہو؟ اس وقت ان نیکیوں کی قدر و قیمت معلوم ہوگی۔

ہم نے تلاوتِ قرآنِ کریم چھوڑ دی

بہرحال، قرآنِ کریم کی تلاوت مستقل فضیلت کا باعث اور اجر و ثواب کا ذریعہ

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء اسلام سے لے کر آج تک اُمتِ مسلمہ کا معمول رہا ہے کہ صبح کو بیدار ہونے کے بعد جب تک قرآنِ کریم کی تھوڑی سی تلاوت نہ کرلیتے، اس وقت تک دنیا کے دوسرے کاموں میں نہیں لگتے تھے۔ صبح کے وقت مسلمانوں کے محلّے سے گزریں تو گھر گھر سے قرآن کریم کی تلاوت کی آوازیں آیا کرتی تھیں، اور تلاوت کی آواز آنا یہ مسلمانوں کے محلّے کی نشانی تھی۔ افسوس ہے کہ آج ہم نے ایک طرف کفر اور شرک سے بھی آزادی حاصل کرلی اور دوسری طرف اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور ان کی تعلیمات سے اور دین سے بھی آزاد ہوگئے، اور اب ہر سال آزادی کا جشن منایا جاتا ہے، چراغاں کیا جاتا ہے، جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں کہ ہمیں آزادی حاصل ہوگئی۔ لیکن ایسی آزادی حاصل ہوئی کہ اس کے بعد ہم دین سے بھی آزاد ہوگئے، اور اس کے نتیجے میں نہ ہماری جانیں محفوظ ہیں، نہ مال محفوظ ہے، نہ آبرو محفوظ ہے بلکہ فسق و فجور کا بازار گرم ہے۔ اسی کو ہم نے آزادی کا نام دیدیا، اور اب ہماری پوری قوم یہ عذاب بھگت رہی ہے۔

قرآنِ کریم کی لعنت سے بچیں

آج قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے والا نہیں ملتا، اور اگر کوئی شخص قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا بھی ہے تو وہ اس طرح تلاوت نہیں کرتا جس طرح تلاوت کرنے کا حق ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض اوقات انسان تلاوت کرتا ہے لیکن قرآنِ کریم کے حروف اس کو لعنت کررہے ہوتے ہیں، اس لئے کہ وہ قرآنِ کریم کو بگاڑ کر پڑھتا ہے اور صحیح طریقے سے پڑھنے کی فکر، دھیان اور خیال نہیں ہے۔ اگر ایک شخص آج ہی مسلمان ہوا اور وہ غلط طریقے سے قرآنِ کریم پڑھے تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معذور ہے، لیکن اگر کسی نے ساری عمر گزار دی پھر بھی سورۂ فاتحہ تک صحیح طریقے سے پڑھنا نہ آئی تو

ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا عذر پیش کرے گا۔ اس لئے ہمیں اس طرح تلاوت کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا۔ یہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے جس کے بغیر وہ قرآنِ کریم کا پہلا حق بھی ادا نہیں کر سکتا۔ دوسرا حق اور تیسرا حق تو وہ کیا ادا کرے گا۔

ایک صحابی کا واقعہ

ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمان قرآنِ کریم کے الفاظ سیکھنے کے لئے محنتیں اور مشقتیں اور قربانیاں دیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں واقعہ لکھا ہے کہ ایک صحابی عمرو بن سلمۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو میں اس وقت بچہ تھا، اور میرا گاؤں مدینہ منورہ سے بہت فاصلے پر تھا۔ میرے قبیلے کے کچھ لوگ مسلمان ہوگئے اور مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق عطا فرمائی۔ ایمان لانے کے بعد سب سے بڑی دولت قرآنِ کریم ہے، مجھے یہ خواہش ہوئی کہ میں قرآنِ کریم کے الفاظ یاد کروں، اس کا علم سیکھوں، لیکن پوری بستی میں قرآنِ کریم پڑھانے والا کوئی نہیں تھا اور قرآنِ کریم سیکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ میں یہ کرتا کہ میری بستی کے باہر قافلوں کے گزرنے کا جو راستہ تھا، روزانہ صبح کے وقت وہاں جاکر کھڑا ہوجاتا، جب کوئی قافلہ گزرتا تو میں پوچھتا کہ کیا یہ قافلہ مدینہ منورہ سے آیا ہے؟ جب قافلہ والے بتاتے کہ ہم مدینہ منورہ سے آئے ہیں تو پھر ان سے درخواست کرتا کہ آپ میں سے کسی کو قرآنِ کریم کا کچھ حصہ یاد ہو تو مجھے سکھادیں، جن کو یاد ہوتا میں ان سے وہ حصہ یاد کرلیتا۔ یہ میرا روزانہ کا معمول تھا۔ اس طرح چند مہینوں کے اندر میں اپنی بستی میں سب سے زیادہ قرآنِ کریم کا یاد کرنے والا ہوگیا اور سب سے زیادہ سورتیں مجھے یاد تھیں۔ چنانچہ جب میری بستی میں مسجد کی تعمیر ہوئی اور امامت کے لئے کسی کو آگے بڑھانے کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھے آگے کردیا، اس لئے کہ سب سے زیادہ قرآنِ کریم

مجھے یاد تھا۔

قرآنِ کریم اسی طرح محفوظ ہے

بہرحال، اس طرح لوگوں نے محنت اور مشقت کر کے قرآنِ کریم حاصل کیا، اور انہی کی محنت اور جدّوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج "الحمدللہ" یہ قرآنِ کریم بفضلہ تعالیٰ صحیح شکل و صورت میں موجود ہے، اور نہ صرف الفاظ بلکہ معانی بھی محفوظ ہیں۔ آج الحمدللہ پورے اطمینان کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ قرآنِ کریم کی وہ صحیح تفسیر جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرامؓ تک اور صحابہ کرامؓ سے لے کر ہم تک پہنچی ہے وہ اپنی صحیح شکل و صورت میں محفوظ ہے، اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس کے الفاظ کی حفاظت کا انتظام فرمایا ہے، اسی طرح اس کے معانی کا بھی انتظام فرمایا ہے۔

عربی لغت کی حفاظت کا ایک طریقہ

معانی کی حفاظت کس طرح فرمائی؟ اس کی ایک چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک بزرگ اور عالم گزرے ہیں علامہ حموی رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "معجم البلدان" اس کتاب میں انہوں نے اپنے زمانے تک کے مشہور شہروں کے حالات اور ان کی تاریخ بیان فرمائی ہے۔ گویا کہ یہ جغرافیہ اور تاریخ کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے لکھا ہے کہ جزیرہ عرب میں دو قبیلے تھے: ایک کا نام عکاد اور دوسرے کا نام ضرائب تھا۔ ان دونوں کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی مہمان دوسرے شہر اور دوسری بستی کا ان کے قبیلے میں آتا تو یہ لوگ اس مہمان کو اپنے یہاں تین دن سے زیادہ ٹھہرنے نہیں دیتے تھے۔ حالانکہ اہل عرب بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں اور مہمان کی آمد پر خوشیاں مناتے ہیں، لیکن عکاد اور ضرائب کے قبیلے کے لوگ مہمان کو اپنے یہاں تین دن سے زیادہ

ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم مہمانوں کو تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنے دیتے؟ جواب میں انہوں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ اگر کوئی باہر کا آدمی ہمارے یہاں تین دن سے زیادہ ٹھہر جائے گا تو وہ ہماری زبان خراب کر جائے گا اور زبان سے الفاظ کی ادائیگی کے طریقے، زبان کا مفہوم، زبان کے مختلف الفاظ کے معانی، اور ان کے طریقہ استعمال میں وہ شخص اثر انداز ہو جائے گا اور ہماری زبان کو تبدیل کر دے گا۔ اور ہماری زبان قرآنِ کریم کی زبان ہے، لہٰذا اس زبان کو محفوظ رکھنا ضروری ہے، اس وجہ سے ہم کسی مہمان کو تین دن سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے الفاظ اور اس کے معانی کو محفوظ رکھا۔

قرآنِ کریم کی تعلیم کے لئے بچوں کا چندہ

آج قرآنِ کریم اور اس کے تمام علوم پکی پکائی روٹی کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں، اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس قرآنِ کریم کو اور اس کے علوم کو حاصل کریں اور اس کو اپنی زندگی کے اندر داخل کریں۔ ہمارے ملک اور شہر میں بہت سے مدارس اور مکاتب قائم ہیں جن کے اندر قرآنِ کریم کی تعلیم اور تعلّم کا انتظام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس جگہ پر بھی ایک مدرسے کے قیام کا انتظام ہوا ہے اور اس کے لئے یہ جگہ مختص کی گئی ہے۔ بہت سے مدرسے قائم ہوتے رہتے ہیں اور ان کے لئے چندے بھی بہت کئے جاتے ہیں، لیکن جب بھی کسی مدرسے کے لئے چندے کا معاملہ سامنے آتا ہے تو مجھے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کی ایک بات یاد آتی ہے: وہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ مدرسے کے لئے پیسوں کے چندے کا تو بڑا اہتمام کرتے ہیں حالانکہ پیسوں کا چندہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ میرا یہ تجربہ ہے کہ جب ایک کام اخلاص کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ غیب سے اس کی مدد فرماتے ہیں اور اس کا انتظام فرماتے

ہیں۔ اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہے، اور اس وقت جتنے مدارس چل رہے ہیں، ان سب کے اندر جاکر کھلی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرسکتے ہیں حالانکہ وہاں کوئی اپیل نہیں ہے، کوئی چندہ نہیں ہے، کوئی سفیر نہیں ہے۔ اگر کام کے اندر اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ عطا فرماہی دیتے ہیں۔ لیکن مدارس کے لئے اصل چندہ بچوں کا چندہ ہونا چاہئے۔ اب اگر قائم کرنے والوں نے مدرسے تو قائم کردیئے اور اس پر پیسے بھی خرچ کردیئے، عمارتیں بھی کھڑی کردیں، اور درس و تدریس بھی شروع ہوگیا، لیکن یہ سب ہونے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ مسلمان اس مدرسے میں اپنے بچوں کو بھیجنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ مسلمان اپنے بچوں کو اس لئے بھیجنے کے لئے تیار نہیں کہ مدرسے میں بھیجنے سے نیکیاں ملتی ہیں اور دوسری جگہ بھیجنے سے روپے ملتے ہیں، تو روپے کے مقابلے میں نیکیوں کو ترجیح کس طرح دیں۔

مدرسہ عمارت کا نام نہیں

بہرحال، یہ مدرسہ تو قائم ہورہا ہے، لیکن مدرسہ عمارت کا نام نہیں، مدرسہ جگہ اور پلاٹ کا نام نہیں، مدرسہ درسگاہ کا نام نہیں، بلکہ پڑھنے اور پڑھانے والوں کا نام مدرسہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا نام تو آپ سب نے سنا ہوگا، اتنی بڑی دینی درسگاہ، لیکن جب وہ قائم ہوا تو اس وقت اس کی نہ کوئی عمارت تھی نہ کوئی جگہ تھی نہ کوئی کمرہ تھا بلکہ ایک انار کے درخت کے نیچے بیٹھ کر ایک استاد اور ایک شاگرد نے پڑھنا پڑھانا شروع کردیا اور اس طرح "دارالعلوم دیوبند" قائم ہوگیا۔ اور یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چبوترے پر پہلا مدرسہ قائم فرمایا اور ایک "صُفّہ" پر صحابہ کرامؓ آکر جمع ہوگئے اور دنیا کا عظیم الشان مدرسہ قائم ہوگیا۔

اور اگر مدرسہ تو قائم ہوگیا لیکن سارے محلّے کے لوگ اس سے غافل ہیں، نہ تو خود قرآنِ کریم کی تعلیم حاصل کرنے کو تیار ہیں اور نہ بچوں کو اس میں بھیجنے کے لئے

تیار ہیں، تو اس طرح مدرسے سے کماحقہٗ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ حضرات سے میری گزارش یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس مدرسے کے ساتھ مالی تعاون فرمائیں بلکہ ساتھ ساتھ اس بات کی کوشش کریں کہ لوگوں کے دلوں میں قرآنِ کریم سیکھنے اور پڑھنے کا اہتمام پیدا ہو اور اپنے بچوں کو بھیجیں، اور جن بڑوں کا قرآنِ کریم صحیح نہیں ہے وہ اپنے قرآن کریم صحیح کرنے کا اہتمام کریں۔ اگر یہ کام ہم نے کرلیا تو انشاء اللہ یہ مدرسہ بڑا کامیاب اور مفید ہوگا اور ہمارے لئے ذخیرہ آخرت ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اس مدرسے کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائے، اور اس مدرسہ کے قیام میں جن لوگوں نے محنت اور کوشش کی ہے اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے، اور اس مدرسہ کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، اور مسلمانوں کو اس مدرسہ سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھانے کی طرف متوجہ فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

غلط نسبت سے بچیئے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی
وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب
اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

غلط نسبت سے بچئے

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات أعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضلّ لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد أن لا الٰہ إلا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہٗ، ونشھد أن سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہٗ، صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ وأصحابہ وبارک وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیراً۔

اما بعد!

﴿عن جابر بن عبداللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من تحلی بمالم یعط کان کلابس ثوبی زور﴾

(ترمذی۔ کتاب البر والصلہ، باب ماجاء فی المتشبع بمالم یعطہ

حدیث کا مطلب

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص آراستہ ہو ایسی چیز سے جو اس کو نہیں دی گئی تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے بارے میں لوگوں کے سامنے کوئی ایسی صفت ظاہر کرے جو حقیقت میں اس کے

اندر موجود نہیں، تو گویا اس نے اپنے پورے جسم پر سر سے لے کر پاؤں تک جھوٹ لپیٹ رکھا ہے، اور جس طرح لباس سارے جسم کو ڈھاپا ہوا ہوتا ہے، اس طرح اس نے جھوٹ سے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا ہے۔

یہ بھی جھوٹ اور دھوکہ ہے

مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ آدمی دھوکہ دینے کے لئے اپنے لئے کوئی ایسی صفت ظاہر کرے جو حقیقت میں اس کے اندر نہیں ہے، مثلاً ایک شخص عالم نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو عالم ظاہر کرتا ہے۔ یا ایک شخص ایک خاص منصب نہیں رکھتا، لیکن اپنے آپ کو اس خاص منصب کا حامل ظاہر کرتا ہے۔ یا ایک شخص خاص حسب نسب سے تعلق نہیں رکھتا، مگر اپنے آپ کو اس نسب کے ساتھ منسوب کرتا ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ جھوٹ کے کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔ اسی طرح ایک شخص مالدار نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو مالدار ظاہر کرتا ہے۔ بہر حال، جو صفت انسان کے اندر موجود نہیں ہے، لیکن وہ بناوٹی طور پر اس صفت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس حدیث میں اس پر یہ وعید بیان فرمائی گئی ہے۔

اپنے نام کے ساتھ "فاروقی" "صدیقی" لکھنا

مثلاً ہمارے معاشرے میں اس میں بہت ابتلاء پایا جاتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو کسی ایسے نسب اور خاندان سے منسوب کردیتے ہیں جس کے ساتھ حقیقت میں تعلق نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی شخص "صدیقی" نہیں ہے، لیکن اپنے نام کے ساتھ "صدیقی" لکھتا ہے، یا کوئی شخص "فاروقی" نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو "فاروقی" لکھتا ہے، یا کوئی شخص "انصاری" نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو "انصاری" لکھتا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو کسی اور نسب کی طرف منسوب کرنا جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ بڑا سخت گناہ ہے۔ اور اس کے بارے میں اس حدیث میں فرمایا

کہ گویا اس نے سر سے لیکر پاؤں تک جھوٹ کا لباس پہنا ہوا ہے۔

کپڑوں سے تشبیہ کیوں؟

اس گناہ کو جھوٹ کے کپڑے پہننے والے سے اس لئے تشبیہ دی کہ ایک گناہ تو وہ ہوتا ہے جس میں انسان تھوڑی دیر کے لئے مبتلا ہوا، پھر وہ گناہ ختم ہوگیا۔ لیکن جس شخص نے غلط نسبت اختیار کر رکھی ہے، اور لوگوں میں اپنی ایسی حیثیت ظاہر کر رکھی ہے جو حقیقت میں اس کی حیثیت نہیں ہے تو وہ ایک دائمی گناہ ہے، اور ہر وقت اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ جس طرح لباس انسان کے ساتھ ہر وقت چپکا رہتا ہے، اسی طریقے سے یہ گناہ بھی ہر وقت انسان کے ساتھ چپکا رہے گا۔

جولاہوں کا "انصاری" اور قصائیوں کا "قریشی" لکھنا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس کا نام ہے "غایات النسب" کیونکہ بعض قومیں اپنے ناموں کے ساتھ غلط نسبتیں لگالیتی ہیں۔ ہندوستان میں یہ بات عام تھی کہ کپڑے بُننے والے جن کو "جولاہے" کہا جاتا تھا، وہ اپنے نام کے ساتھ "انصاری" لکھتے تھے۔ اور گوشت فروخت کرنے والے قصائی اپنے ناموں کے ساتھ "قریشی" لکھتے تھے۔ اس لئے حضرت والدصاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ رسالہ لکھا اور اس میں اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ نسب کے بارے میں جھوٹا بیان کرنا سخت گناہ ہے، اور اس کے بارے میں کئی احادیث آئی ہیں جن میں جھوٹی نسبت سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ اس رسالہ کے لکھنے کے نتیجے میں ان قوموں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف پورے ہندوستان میں ایک طوفان کھڑا کردیا کہ انہوں نے ہمارے خلاف بڑی سخت کتاب لکھی ہے۔ لیکن حقیقت وہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی۔

نسب اور خاندان فضیلت کی چیز نہیں

بات دراصل یہ ہے کہ "نسب" اور "خاندان" کا معاملہ ایسا ہے کہ اس پر کوئی دینی فضیلت موقوف نہیں، کوئی شخص کسی بھی نسب اور خاندان سے تعلق رکھتا ہو، لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو "تقویٰ" عطا فرمایا ہے تو وہ اچھے سے اچھے نسب والے سے بہتر ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے صاف اعلان فرمادیا:

﴿یٓایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر وّاُنثٰی وجعلنٰکم
شعوبًا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللّٰہ اتقٰکم﴾

(الحجرات: ۱۳)

یعنی اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ مرد حضرت آدم علیہ السلام اور عورت حضرت حوا علیہا السلام۔ اس لئے جتنے بھی انسان دنیا میں آئے ہیں سب ایک ماں باپ کے بیٹے ہیں۔ البتہ ہم نے یہ جو مختلف قبیلے بنادیے کہ کسی انسان کا تعلق کسی قبیلے سے ہے، اور کسی انسان کا تعلق کسی خاندان سے ہے، یہ خاندان اور قبیلے اس لئے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اگر سب انسان ایک ہی قبیلے کے ہوتے تو ایک دوسرے کو پہچاننے میں دشواری ہوتی، اب یہ بتا دینا آسان ہے کہ یہ فلاں شخص ہے اور فلاں قبیلے کا ہے۔ لہٰذا صرف پہچان کی آسانی کی خاطر ہم نے تمہیں قبیلوں میں تقسیم کیا ہے، لیکن کسی قبیلے کو دوسرے قبیلے پر کوئی فضیلت نہیں، بلکہ تم میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ والا اور عزت والا وہ ہے جس میں تقویٰ زیادہ ہو۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی ایسے نسب اور خاندان سے وابستہ ہے جس کو لوگ اعلیٰ نسب نہیں سمجھتے تو کوئی پرواہ کی بات نہیں، تم اپنے اعمال اور اخلاق صحیح کرو، اور اپنی زندگی کا کردار درست کرو تو پھر کردار اور عمل کے نتیجے میں تم اعلیٰ سے اعلیٰ نسب والے سے آگے بڑھ جاؤ گے۔

لہٰذا کیوں اپنے آپ کو غلط خاندان کی طرف منسوب کر کے گناہ کا ارتکاب کرتے ہو؟ اس لئے جس شخص کا جو نسب ہے وہ اسی کو بیان کرے۔ اور نسب بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، بیان ہی نہ کرے، لیکن اگر بیان کرنا ہی ہے تو وہ نسب بیان کرے جو اپنا واقعی نسب ہے، بلاوجہ دوسرے نسب کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا جائز نہیں، اس پر بڑی سخت وعید بیان فرمائی گئی ہے۔

''متبنیٰ'' کو حقیقی باپ کی طرف منسوب کریں

اسی طرح کا ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے جس پر قرآن کریم نے آدھا رکوع نازل کیا ہے: وہ یہ کہ بعض اوقات کوئی شخص دوسرے کے بچے کو اپنا ''متبنیٰ'' ''لے پالک'' بنالیتا ہے، مثلاً کسی شخص کی کوئی اولاد نہیں ہے، اس نے دوسرے کا بچہ گود لے لیا اور اس کی پرورش کی، اور اس کو اپنا ''متبنیٰ'' بنالیا، تو شرعاً متبنیٰ بنانا اور کسی بچے کی پرورش کرنا اور اپنے بیٹے کی طرح اس کو پالنا تو جائز ہے، لیکن شرعی اعتبار سے وہ ''متبنیٰ'' کسی بھی حالت میں اس پالنے والے کا حقیقی بیٹا نہیں بن سکتا۔ لہٰذا جب اس بچے کو منسوب کرنا ہو تو اس کو اصل باپ ہی کی طرف منسوب کرنا چاہئے کہ فلاں کا بیٹا ہے، پرورش کرنے والے کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں۔ اور رشتے کے جتنے احکام ہیں وہ سب اصل باپ کی طرف منسوب ہوں گے، یہاں تک کہ جس شخص نے اس کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہے، اور جو عورت منہ بولی ماں بنی ہے، اگر وہ نامحرم ہے تو اس بچے کے بڑے ہونے کے بعد اس سے اسی طرح پردہ کرنا ہوگا جس طرح ایک نامحرم سے پردہ ہوتا ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ

حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا متبنیٰ بنایا تھا۔ ان کا واقعہ بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ یہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ زمانہ جاہلیت میں کسی کے غلام تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو مکہ مکرمہ آنے کی توفیق دی، یہاں آکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر مسلمان ہوگئے۔ ان کے ماں باپ اور خاندان کے دوسرے افراد ان کی تلاش میں تھے کہ کہاں ہیں، تلاش کرتے کرتے کئی سال گزر گئے، کئی سال کے بعد کسی نے ان کو خبر دی کہ حضرت زید بن حارثہ مکہ مکرمہ میں ہیں اور وہ مسلمان ہو چکے ہیں، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے والد اور چچا تلاش کرتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور جاکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اور کہا کہ یہ زید بن حارثہ جو آپ کے پاس رہتا ہے، یہ ہمارا بیٹا ہے، ہم اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں، یہ ہمیں نہیں مل رہا تھا، اب یہاں ہمیں مل گیا ہے، ہم اس کو لے جانا چاہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ٹھیک ہے تم اس کے باپ ہو، اور وہ تمہارا بیٹا ہے، جاکر اس سے پوچھ لو، وہ اگر تمہارے ساتھ جانا چاہے تو چلا جائے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر خوش ہو گئے کہ چلو انہوں نے بہت آسانی سے اجازت دے دی۔ اب یہ دونوں باپ اور چچا اس خیال میں تھے کہ بیٹے کو جدا ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں۔ باپ اور چچا کو دیکھ کر خوش ہو جائے گا اور ساتھ چلنے کے لئے فوراً تیار ہو جائے گا۔ اس وقت حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حرم میں تھے۔ جب یہ دونوں ان کو لینے کے لئے وہاں پہنچے اور ملاقات کی تو انہوں نے فی الجملہ خوشی کا اظہار تو کیا، لیکن جب باپ نے یہ کہا کہ اب میرے ساتھ گھر چلو، تو انہوں نے کہا: نہیں، ابا جان میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اس لئے کہ ایک

طرف تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمادیا ہے، اور آپ کو ابھی تک اسلام کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ یہاں پر مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہے، اس صحبت کو چھوڑ کر میں نہیں جاسکتا۔ باپ نے ان سے کہا: بیٹا تم اتنے عرصہ کے بعد مجھ سے ملے، اس کے باوجود تم نے مجھے اتنا مختصر سا جواب دیدیا کہ تم میرے ساتھ نہیں جاسکتے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے جو حقوق ہیں، میں ان کو ادا کرنے کو تیار ہوں، لیکن جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا جو تعلّق قائم ہوا ہے وہ اب مرنے جینے کا تعلّق ہے، اس لئے میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ جواب سنا تو آپ نے فرمایا کہ چونکہ تم نے میرے ساتھ یہ تعلّق قائم کیا ہے اس لئے میں تمہیں آج سے اپنا بیٹا بناتا ہوں۔ اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا متبنیٰ بنالیا۔ اس کے بعد سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ بیٹے جیسا ہی سلوک فرماتے، تو لوگوں نے بھی ان کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ کر پکارنا شروع کردیا، جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿ادعوھم لاٰبآءھم ھو اقسط عند اللّٰہ﴾ (الاحزاب:۵)

یعنی تم لوگوں نے متبنیٰ کا جو نسب بیان کرنا شروع کردیا ہے، یہ درست نہیں، بلکہ جو بیٹا جس باپ کا ہے اس کو اسی حقیقی باپ کی طرف منسوب کرو، کسی اور کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ اور دوسری جگہ یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللّٰہ وخاتم النبیّن﴾ (الاحزاب:۴۰)

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے حقیقی باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں، اس لئے ان کی طرف کسی بیٹے کو منسوب مت کرو۔ اور آئندہ کے لئے یہ اصول مقرر فرما دیا کہ کوئی متبنیٰ آئندہ اپنے منہ بولے باپ کی طرف منسوب نہیں ہوگا، بلکہ حقیقی باپ کی طرف منسوب ہوگا۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ ایک اور صحابی حضرت سالم مولیٰ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، ان کو بھی متبنیٰ بنایا گیا تھا۔ ان کے بارے میں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ یہ منہ بولے باپ کی طرف منسوب نہیں ہوں گے، اور جب یہ اپنے منہ بولے باپ کے گھر میں داخل ہوں تو پردے کے ساتھ داخل ہوں۔

یہ سب احکام اس لئے دیے گئے کہ شریعت نے نسب کے تحفظ کا بہت اہتمام فرمایا ہے کہ کسی کی نسبت غلط نہ ہوجائے، اس کی وجہ سے مغالطہ پیدا نہ ہوجائے۔ اس لئے جو شخص اپنا نسب غلط بیان کرنے وہ اس حدیث کی وعید کے اندر داخل ہے اور وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔

اپنے نام کے ساتھ "مولانا" لکھنا

اسی طرح اگر کوئی شخص علم کا حامل نہیں ہے لیکن اپنے آپ کو عالم ظاہر کرتا ہے مثلاً آج کل لوگ اپنے نام کے ساتھ "مولانا" لکھ دیتے ہیں، حالانکہ عرف عام میں لفظ "مولانا" یا لفظ "علامہ" ان افراد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جو باقاعدہ دین کے حامل ہوں، اب اگر ایک شخص دین کا حامل نہیں ہے، وہ اگر ان الفاظ کو استعمال کرے گا تو اس کی وجہ سے مغالطہ پیدا ہوگا، اور وہ اس حدیث کی وعید میں داخل ہوگا۔

اپنے نام کے ساتھ "پروفیسر" لکھنا

اسی طرح لفظ "پروفیسر" ہے۔ ہمارے معاشرے میں "پروفیسر" ایک خاص منصب ہے، اس کی خاص شرائط ہیں۔ ان شرائط کو جو شخص پوری کرے گا تو وہ پروفیسر کہلائے گا۔ لیکن آج کل یہ حال ہے کہ جو شخص کسی جگہ کا استاذ بن گیا وہ اپنے نام کے ساتھ پروفیسر لکھ دیتا ہے، حالانکہ اس کے ذریعہ وہ اپنی ایک ایسی صفت ظاہر کر رہا ہے جو اس کے اندر موجود نہیں ہے۔ اس لئے یہ غلط بیانی ہے اور دوسروں کو مغالطہ میں ڈالنا ہے اور یہ بھی اس حدیث کی وعید کے اندر داخل ہے، اور حرام ہے، اور ناجائز ہے۔

لفظ "ڈاکٹر" لکھنا

اسی طرح ایک شخص "ڈاکٹر" نہیں ہے، لیکن اپنے نام کے ساتھ لفظ "ڈاکٹر" لکھ دیا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہوں نے چند دن تک کسی ڈاکٹر کے پاس کمپاؤڈری کی، اس کے نتیجے میں کچھ دواؤں کے نام یاد ہوگئے، تو بس اس کے بعد اپنے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" لکھنا شروع کر دیا، اور پھر باقاعدہ کلینک کھول کر بیٹھ گئے اور علاج شروع کر دیا۔ یہ بھی اس وعید کے اندر داخل ہے اور یہ نسبت کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ یہ سب مغالطے اس حدیث کے تحت داخل ہیں کہ جو شخص ایسی چیز ظاہر کرے جو حقیقت میں اس کے اندر نہیں ہے تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔

جیسا اللہ نے بنایا ہے ویسے ہی رہو

اور یہ سب گناہ ایسے نہیں ہیں کہ ان کو ایک مرتبہ کرلیا، بس وہ گناہ ختم ہوگیا، بلکہ چونکہ اس شخص نے اس نسبت کو اپنے نام کا جز بنا رکھا ہے، مثلاً لفظ مولانا یا

ڈاکٹر یا پروفیسر وغیرہ کو اپنے نام کا حصہ بنا رکھا ہے، تو وہ گناہ مستقل اور دائمی ہے، اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ چلا جارہا ہے۔ اس لئے گناہ کو جھوٹ کے کپڑے پہننے سے تشبیہ دی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس گناہ سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

ارے بھئی، اپنی کوئی صفت بیان کرنے میں کیا رکھا ہے، جیسا اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، ویسے ہی رہو، اور بلاوجہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش میں نہ پڑو۔ بلکہ جو صفت اللہ تعالیٰ نے دی ہے، بس وہی صفت ظاہر کرو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے کسی کو کوئی صفت دیدی، کسی کو کوئی صفت دیدی۔ زندگی کا یہ سارا کاروبار اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت سے چل رہا ہے، تم اس کے اندر دخل اندازی کر کے ایک غلط بات ظاہر کرو گے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوگی۔

مالداری کا اظہار

اسی طرح اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ایک آدمی زیادہ مالدار نہیں ہے، لیکن لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اپنے آپ کو بہت مالدار ظاہر کرتا ہے اور دکھاوے کے لئے ایسے کام کرتا ہے تاکہ لوگ مجھے زیادہ دولت مند سمجھ کر میری زیادہ عزت کریں۔ یہی دکھاوا ہے اور یہی نام و نمود ہے۔ یہ بات بھی اسی گناہ میں داخل ہے۔

نعمتِ خداوندی کا اظہار کریں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر قربان جائیں، آپ نے ایسی ایسی باریک تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو انسان کے تصوّر میں بھی نہیں آسکتیں۔ چنانچہ آپ کی تعلیمات پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو حکم علیحدہ علیحدہ ہیں: ایک حکم تو یہ ہے کہ جو صفت تمہارے اندر موجود نہیں ہے وہ ظاہر مت کرو تاکہ اس کی وجہ سے دوسرے کو دھوکہ نہ ہو۔ لیکن دوسری طرف آپ نے دوسری تعلیم دیتے

ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿إِن اللّٰہَ یُحِبُّ أن یَری أثَرَ نعمته علی عبده﴾

(ترمذی۔ ابواب الادب: باب ماجاء ان اللہ یحب ان یری)

یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بندے کو جو نعمت عطاء فرمائی ہے، اس نعمت کے آثار اس بندے پر ظاہر ہوں۔ مثلاً ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے کھاتا پیتا بنایا ہے اور اس کو مال و دولت عطاء فرمائی ہے، تو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنا رہن سہن ایسا رکھے جس سے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا اظہار ہو، مثلاً وہ صاف ستھرے کپڑے پہنے، صاف ستھرے گھر میں رہے۔ اگر وہ شخص اس دولت کی نعمت کے باوجود فقیر اور مسکین بنا پھرتا ہے، میلا کچیلا اور پھٹا پُرانا لباس پہنا رہتا ہے اور گھر کو گندا رکھتا ہے، تو ایسی صورت بنانا ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے۔ ارے بھائی! جب اللہ تعالیٰ نے نعمت عطا فرمائی ہے تو اس کے آثار تمہاری زندی پر ظاہر ہونے چاہئیں۔ تمہاری صورت دیکھ کر کوئی تمہیں فقیر نہ سمجھ لے، اور کوئی تمہیں مستحق زکوٰۃ سمجھ کر تمہیں زکوٰۃ نہ دیدے۔ اس لئے جیسے حقیقت میں تم ہو ویسے ہی رہو۔ نہ تو اپنے آپ کو زیادہ ظاہر کرو، اور نہ ہی اتنا کم ظاہر کرو جس سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہو۔

عالم کے لئے علم کا اظہار کرنا

علم کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے تو اب تواضع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی چھپ کر ایک کونے میں بیٹھ جائے، اس خیال سے کہ اگر میں دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو عالم ظاہر کروں گا تو اس کے نتیجے میں لوگ مجھے عالم سمجھیں گے اور یہ تواضع کے خلاف ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے علم کی نعمت عطا فرمائی ہے تو اس نعمت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس علم کا اتنا اظہار کرے کہ جس سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ اور علم کی نعمت کا شکریہ بھی

یہی ہے کہ بندوں کی خدمت میں اس علم کو استعمال کرے۔ وہ علم اللہ تعالیٰ نے اس لئے نہیں دیا کہ تم تکبر کر کے بیٹھ جاؤ، وہ علم اس لئے نہیں دیا کہ اس کے ذریعہ تم لوگوں پر اپنا رعب جماؤ، بلکہ وہ علم اس لئے دیا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کی خدمت کرو۔ لہٰذا دونوں طرف توازن برقرار رکھتے ہوئے آدمی کو چلنا پڑتا ہے، یہ سب دین کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین

بُری حکومت کی نشانیاں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بُری حکومت کی نشانیاں

الحمد للّٰہ نحمده و نستعینه ونستغفره ونؤ من به ونتوکّل علیه، ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سیئات أعمالنا، من یهده اللّٰه فلا مضلّ له ومن یضلله فلا هادی له، ونشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لا شریك له، ونشهد ان سیدنا ونبینا ومولانا محمداً عبده ورسوله، صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وعلیٰ آله واصحابه وبارك وسلم تسلیماً کثیراً

اَمّابعد : حدثنا سعید بن سمعان قال : سمعت أباهریرة رضی اللّٰه تعالیٰ عنهٗ یتعوّذ من امارة الصبیان والسفهاء، فقال سعید بن سمعان: فاخبرنی ابن حسنة الجهنی أنه قال لأبی هریرة: ماآیة ذلك ؟ قال: ان یقطع الارحام، ویطاع المغوی، ویعصی المرشد

(ادب المفرد، باب: قاطع رحم کی سزا)

بُرے وقت سے پناہ مانگنا

حضرت سعید بن سمعان رحمۃ اللہ علیہ جو تابعین میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کو سنا کہ وہ بچوں اور بے وقوفوں کی حکمرانی سے پناہ مانگ رہے تھے۔

اشارہ اس بات کی طرف فرمادیا کہ وہ بہت بُرا وقت ہوگا جب نوعمر اور

ناتجربہ کار اور بیوقوف لوگ امیر اور حاکم بن جائیں، اس لئے آپ پناہ مانگتے تھے کہ یا اللہ! ایسے بُرے وقت سے مجھے بچائیے، اور ایسا وقت نہ آئے کہ مجھے ایسے حاکموں سے واسطہ پڑے۔

بُرے وقت کی تین علامتیں

حضرت سعید بن سمعان فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے یہ پناہ مانگی تو ان سے پوچھا گیا کہ ایسے بُرے وقت کی علامت کیا ہوگی؟ یعنی کس طرح یہ پہچانا جائیگا کہ یہ بیوقوف لوگوں کی حکمرانی کا دور ہے؟ جواب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ!

ان تقطع الأ رحام، ویطاعَ المغوی و یعصی المرشد

یعنی اس دور کی تین علامتیں ہیں: پہلی علامت یہ ہے کہ اس دور میں لوگ رشتہ داروں کے حقوق پامال کریں گے اور قطع رحمی کی جائے گی۔ دوسری علامت یہ ہے کہ گمراہ کرنے والوں کی اطاعت کی جائے گی، لوگ ان کے پیچھے چلیں گے اور ان کی اتباع کریں گے۔ تیسری علامت یہ ہے کہ ہدایت اور رہنمائی کرنے والے لوگوں کی نافرمانی کی جائے گی۔ جب یہ تین علامتیں کسی دور میں پائی جائیں تو اس سے پتہ چل جائے گا کہ یہ بیوقوفوں کی اور سفہاء اور نوعمروں کی حکمرانی ہے۔

قیامت کی ایک نشانی

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی جو علامات بیان فرمائی ہیں، ان میں سے ایک علامت یہ بیان فرمائی ہے کہ!

أن تَرَى الْحُفاةَ الْعراةَ العَالَةَ رِعَاءَ الشاء يَتطا وَلُوْنَ فِي الْبنْيانِ

قیامت کی ایک علامت یہ ہے کہ ننگے پاؤں والے، ننگے بدن
والے، دوسروں کے دست نگر، بکریوں کے چرواہے اونچی
اونچی عمارتوں میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔

یعنی وہ لوگ جن کا نہ تو ماضی اچھا ہے، اور نہ ہی جن کے عادات واخلاق شریفانہ ہیں، اور معمولی قسم کے لوگ ہیں جن کی تربیت بھی صحیح طریقے سے نہیں ہوئی، جن کے پاس دین بھی پورا نہیں ہے، ایسے لوگ حکمران بن جائیں گے، اور بڑی اونچی اونچی عمارتوں میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔ یہ علامات قیامت میں سے ایک علامت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی۔

جیسے اعمال ویسے حکمران

بہر حال، حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد سے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کو ایسے لوگوں کی حکومتوں سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے جن کے اندر حکومت کے کاروبار چلانے کی اہلیت نہ ہو۔ اور اگر کوئی شخص ایسی حکومت میں مبتلا ہو جائے جیسے ہم اور آپ اس وقت مبتلا ہیں، تو ایسے موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ایسے موقع کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ یاد رکھو! جب مسلمانوں پر خراب حکمران مسلط ہوتے ہیں، تو یہ سب تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں،

كَمَا تَكُونُون يؤمّر عليكم

یعنی جیسے تم ہوگے ویسے ہی حکمران تم پر مسلط کئے جائیں گے اور ایک روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں!

انما اعمالكم عمّالكم

یعنی تمہارے اعمال ہی بالآخر عمال اور حکمران کی شکل میں تمہارے سامنے آتے ہیں۔ لہذا اگر تمہارے اعمال اچھے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ تم پر اچھے حکمران بھیجے گا، اور اگر تمہارے اعمال خراب ہوں گے تو پھر خراب عمال تمہارے اوپر مسلط کئے جائیں گے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی احادیث میں یہ مضمون بیان فرمایا ہے۔

اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جب تمہارے اوپر غلط حکومت مسلط ہو جائے تو حکومت کو برُا بھلا کہنے اور اس کو گالی دینے کا طریقہ چھوڑ دو۔ یعنی یہ مت کہو کہ ہمارے حکمران ایسے عیاّر اور ایسے مکاّر ہیں وغیرہ...... اور ان کو گالی مت دو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو کہ اے اللہ! یہ حکمران جو ہم پر مسلط ہیں، یہ ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے ہم پر مسلط ہوئے ہیں، اے اللہ! اپنی رحمت سے ہماری ان بداعمالیوں کو معاف فرمادیجئے اور ہماری اصلاح فرمادیجئے، اور نیک اور صالح اور متقی و پرہیز گار حکمران ہمیں عطا فرمادیجئے۔ یہ طریقہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ اس لئے کہ صبح و شام حکمرانوں کو گالیاں دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اپنے اعمال کے اصلاح کی فکر کرو۔

ہمارا طرزِ عمل

اب ہم ذرا اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم میں سے ہر شخص صبح و شام یہ رونا رو رہا ہے کہ ہم پر غلط قسم کے حکمران مسلط ہیں۔ اور نااہل حکمران مسلط ہیں۔ چنانچہ جب کبھی چار آدمی کہیں بیٹھ کر بات کریں گے اور حکومت کا ذکر

آئے گا، تو اس حکومت پر لعنت و ملامت کے دو چار جملے ضرور نکال دیں گے۔ یہ کام تو ہم سب کرتے ہیں، لیکن ہم ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ کیا کبھی واقعۃً سچے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے یہ کہا کہ یا اللہ! ہم پر یہ بلا اور مصیبت مسلّط ہے، اور ہماری بداعمالیوں ہی کی وجہ سے ہے، اے اللہ! ہماری ان بداعمالیوں کو معاف فرما دیجئے، اور اے اللہ! ان کی جگہ پر ہمیں صالح حکمران عطا فرما دیجئے۔ اب بتایئے کہ ہم میں سے کتنے افراد یہ دعا کرتے ہیں۔ مگر تنقید اور بُرا بھلا کہنا تو دن رات ہو رہا ہے، کوئی مجلس اس سے خالی نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ دیکھئے! دن میں پانچ مرتبہ ہم نماز پڑھتے ہیں اور نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعائیں تو کرتے ہی ہیں، لیکن کیا کبھی نمازوں کے بعد یہ دعا بھی کی کہ اے اللہ! یہ شامت اعمال جو ہم پر مسلّط ہے، اس کو اٹھا لیجئے۔ اگر ہم نمازوں کے بعد یہ دعا نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ ہمیں بتایا تھا، اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، پھر اس کے ساتھ ساتھ اپنے حالات کی درستی کی فکر کرو۔ انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ فضل فرما دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو

ایک اور حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ جتنے سلاطین، حکمران اور صاحبانِ اقتدار ہیں، ان کے دل اللہ تعالیٰ ہی کے قبضے میں ہیں۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کو راضی کرلو، اور اس کی طرف رجوع کرلو تو اللہ تعالیٰ انہی حکمرانوں کے دل بدل دیں گے، اور انہی کے دل میں خیر پیدا فرما دیں گے۔ اور اگر ان کے لئے خیر مقدّر نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے بدلے میں اچھے حکمران عطا فرما دیں گے۔ لہذا محض گالیاں دینے سے اور محض تنقید کرنے سے

کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ بہت کم اللہ کے بندے ایسے ہیں جو ان حالات میں درد محسوس کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مناجات کرتے ہیں اور روتے ہیں اور اللہ کے سامنے گڑ گڑا کر دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اس بلا سے ہمیں نجات عطا فرما دیجئے۔ اگر ہم یہ کام شروع کر دیں اور اپنے اعمال کو درست کرنے کی فکر کرلیں تو اللہ تعالیٰ ضرور کرم فرما کر صورت حال کو بدل دیں گے۔ بہر حال، اس حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسے حالات میں کرنے کا ایک کام یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگو۔

بری حکومت کی پہلی اور دوسری علامت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خراب اور بُرے حکمرانوں کی حکومت کی ایک علامت یہ بیان فرمائی کہ اس زمانے میں قطعِ رحمی عام ہو جائے گی۔ یعنی رشتہ داروں کے حقوق پامال کئے جائیں گے۔ دوسری علامت یہ بیان فرمائی کہ گمراہ کرنے والے آدمی کی اطاعت کی جائے گی، یعنی جو شخص جتنا بڑا گمراہ ہوگا، اس کے پیچھے اس کے متبعین اور ماننے والے بھی اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ چنانچہ آج اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرلیں کہ آج کے دور پر یہ بات کس طرح صحیح صحیح صادق آرہی ہے کہ آج جو لوگ دوسروں کو گمراہ کرنے والے ہیں، اور جن کے پاس قرآن وسنت کا صحیح علم نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ یا تو دھوکہ باز ہیں یا جاہل ہیں، ایسے لوگ ذرا سا سبز باغ عوام کو دکھا دیتے ہیں، وہ عوام ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں، پھر وہ عوام کو جس راستے پر چاہتے ہیں، لے جاتے ہیں، اور ان کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ جب انسان کی آنکھوں پر پٹی پڑ جاتی ہے تو پھر وہ بڑے سے بڑے گمراہ کو اپنا مقتدا اور پیشوا بنا لیتا ہے، اور وہ یہ نہیں دیکھتا

کہ قرآن وسنت کی رو سے اس کے اعمال واخلاق کیسے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ آمین!!

آغاخان کا محل

ایک مرتبہ میرا سوئٹزرلینڈ جانا ہوا۔ وہاں پر ایک راستے سے گزرتے ہوئے ایک صاحب نے ایک بہت بڑے عالیشان محل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ آغا خان کا محل ہے۔ وہ محل کیا تھا بلکہ وہ جھیل کے کنارے پر واقع ایک عالیشان دنیا کی جنّت معلوم ہو رہی تھی۔ کیونکہ ان ممالک میں عام طور پر لوگوں کے مکانات چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، وہاں بڑے مکانات اور محلاّت کا تصور نہیں ہوتا۔ وہ محل دو تین کلو میٹر میں پھیلا ہوا تھا، اور اس میں باغات اور نہریں اور عالیشان عمارتیں تھیں، اور نوکر چاکر کا ایک لشکر تھا۔ یہ بات تو مشہور ہے کہ فحاشی اور عیّاشی کے ہر کام ان کے یہاں جائز ہوتے ہیں، اور شراب نوشی کا دور بھی چلتا ہے۔

آغا خانیوں سے ایک سوال

تو اس وقت میری زبان پر یہ بات آگئی اور میں نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ جو مقتدا اور پیشوا بنے ہوئے ہیں، کتنی عیّاشیوں میں لگے ہوئے ہیں، اور وہ کام جس کو ایک معمولی درجے کا مسلمان بھی حرام اور ناجائز سمجھتا ہے، ایسے کاموں میں یہ مقتدا اور پیشوا مشغول ہیں، لیکن ان کے ماننے والے اور متبعین پھر بھی ان کو اپنا مقتدا اور پیشوا مانتے ہیں؟ میری یہ باتیں سُن کر میزبانوں میں سے ایک نے کہا کہ اتفاق کی بات ہے کہ جو باتیں آپ نے ان کے بارے میں کہیں، بعینہ یہ باتیں میں نے آغا خان کے ایک معتقد کے سامنے کہیں کہ تم کسی نیک اور متقی آدمی کو پیشوا بناتے تو سمجھ

میں آنے والی بات تھی، لیکن تم نے ایک ایسے آدمی کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنا رکھا ہے جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ وہ عیاشی کے اندر مبتلا ہے، اور اتنے بڑے بڑے عالیشان محلات بنا رکھے ہیں۔ ان سب چیزوں کو دیکھنے کے باوجود پھر بھی تم اس کو سونے میں تولتے ہو اور اس کو اپنا امام مانتے ہو؟

اس کے معتقد کا جواب

تو اس آغا خان کے معتقد نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ یہ تو ہمارے امام کی بڑی قربانی ہے کہ وہ دنیا کے ان محلات پر راضی ہو گیا، ورنہ ہمارے امام کا اصل مقام تو "جنت" تھا۔ لیکن وہ ہماری ہدایت کی خاطر جنت کی ان نعمتوں کو قربان کر کے دنیا میں آیا، اور دنیا کی یہ لذتیں اس کے آگے ہیچ ہیں، ورنہ وہ تو اس سے زیادہ بڑی لذتوں اور نعمتوں کا مستحق تھا۔ یہ وہی بات ہے جس کی طرف اس حدیث کے اندر ان الفاظ میں اشارہ فرمایا کہ:

اَنْ یُطَاعَ الْمُغْوِی

یعنی گمراہ کرنے والوں کی اطاعت کی جائے گی۔ کھلی آنکھوں سے نظر آ رہا ہے کہ ایک شخص گمراہی کے راستے پر ہے، اور فسق و فجور کے کاموں میں مبتلا ہے، پھر اس کو یہ کہہ رہا ہے کہ یہ میرا امام ہے، یہ میرا مقتدا اور پیشوا ہے۔

گمراہ کرنے والوں کی اطاعت کی جارہی ہے

اسی طرح آج کل بہت سے جاہل پیروں کی بادشاہتیں قائم ہیں، ان کو اگر آپ کبھی جاکر دیکھیں تو آپ کی عقل حیران ہو جائے، وہاں پر ان جاہل پیروں کی گدّیاں بچھی ہوئی ہیں، دربار لگے ہوئے ہیں، جن میں منشیات گھونٹ کر پی جارہی ہیں اور پلائی جارہی ہیں، بد سے بدتر کام وہاں کئے جارہے ہیں۔ اس کے

باوجود اس کا معتقد اور اس کو ماننے والا یہ کہتا ہے کہ یہ میرا پیر اس زمین پر خدا کا نمائندہ ہے۔ یہ وہی ہے جس کو حدیث میں بیان کیا گیا کہ جو گمراہ کرنے والا ہے، لوگ اس کے پیچھے چل پڑے ہیں، اور اس کے پیچھے چلنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ہاتھ کچھ شعبدے آگئے ہیں، مثلاً کسی پر تصرّف کیا تو اس کا دل حرکت کرنے لگا کسی دوسرے پر تصرّف کیا تو اس کو کوئی عجیب و غریب خواب آگیا، کسی پر تصرّف کیا تو مسجد حرام کا نقشہ اس کے سامنے آگیا، کسی پر تصرّف کر کے اس کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھادی۔ ان تصرفات کے نتیجے میں لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہ اللہ کا کوئی خاص نمائندہ زمین پر اترا ہے۔ لہٰذا اب یہ جو کچھ کہے اس کی پیروی اور اتباع کرو، چاہے وہ کام حلال ہو یا حرام ہو، جائز ہو یا ناجائز ہو، شریعت کے موافق ہو یا شریعت کے خلاف ہو۔

بُری حکومت کی تیسری علامت

تیسری علامت یہ ہے کہ کوئی اللہ کا نیک بندہ جو متبع سنّت ہو، اور اپنی زندگی شریعت کے مطابق گزارنے کی فکر میں ہو، علم صحیح رکھتا ہو۔ اس کے پاس اگر کوئی شخص اپنی اصلاح کے لئے آئے گا تو وہ اس کو مشقت کے کام بتائے گا اور فرائض کے کرنے کا حکم دے گا کہ نمازیں پڑھو، فلاں کام کرو، فلاں کام کرو اور فلاں کام سے بچو، فلاں گناہ سے بچو، آنکھوں کی حفاظت کرو، زبان کی حفاظت کرو، اور ان تمام گناہوں سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اب وہ صحیح کام بتارہا ہے اور جس کے کرنے میں تھوڑی سی مشقت ہے تو لوگ ایسے شخص کے پاس آنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، کیونکہ یہاں آئیں گے تو مشقت اٹھانی پڑے گی۔ بہرحال، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو بات فرمائی تھی کہ جو گمراہ کرنے والا ہے، اس کی تو خوب اطاعت کی جائے گی، اور جو شخص ہدایت کا صحیح راستہ بتارہا

ہے اس کی نافرمانی کی جائے گی، اور وہ اگر کہے کہ فلاں کام ناجائز اور حرام ہے، اس سے بچو۔ تو جواب میں وہ یہ کہے گا کہ آپ کہاں سے حرام کہنے والے آگئے؟ اور یہ چیز کیوں حرام ہے؟ اس کو حرام کہنے کی کیا وجہ ہے؟ اب اس سے دلیل کا اور حکمت کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ پہلے آپ یہ بتائیں کہ اس حکم میں اور اس حکم میں کیا فرق ہے؟ جنبک تم یہ نہیں بتاؤ گے، ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے، اور پھر اس پر طعنہ و تشنیع کی جاتی ہے کہ ان ملاّؤں نے ہمارے دین کو مشکل اور تنگ کر دیا، اس کی وجہ سے زندگی گزارنی مشکل ہوگئی۔ یہ سب فتنے ہیں جو آج ہمارے دور میں موجود ہیں۔

فتنے سے بچنے کا طریقہ

اس فتنے سے بچنے کا صحیح راستہ یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ جس شخص کے پاس تم جا رہے ہو اور جس شخص کو تم اپنا مقتدا اور پیشوا بنا رہے ہو، وہ سنّت کی کتنی اتباع کرتا ہے؟ یہ مت دیکھو کہ اس کے پاس شعبدے کتنے ہیں؟ اس لئے کہ ان شعبدوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک پیر صاحب کا مقولہ

ایک پیر صاحب کا لکھا ہوا ایک پمفلٹ دیکھا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ "جو شیخ اپنے مریدوں کو یہاں رہتے ہوئے مسجد حرام میں نماز نہ پڑھا سکے وہ شیخ بننے کا اہل نہیں" گویا کہ شیخ بننے کی دلیل یہ ہے کہ جب اس کے پاس کوئی شخص مرید بننے کے لئے آئے تو وہ اس کے اوپر ایسا تصرّف کرے کہ کراچی میں بیٹھے بیٹھے اس کو مسجد حرام نظر آئے، اور وہاں پر اس کو نماز پڑھوائے، وہ اصل میں شیخ بنانے کے قابل ہے۔ اور جس شخص کو یہ کرتب نہ آتا ہو وہ شیخ بنانے کا اہل نہیں۔ کوئی

ان سے پوچھے کہ یہ بات کیا قرآن و حدیث میں کہیں موجود ہے، اس کا کہیں ثبوت ہے؟ کہیں بھی اس کا ثبوت نہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرّمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے اور مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے بیت اللہ کی یاد میں تڑپتے رہے۔ اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ شدید بخار کے عالم میں مکہ مکرمہ اور مسجد حرام کو یاد کر کے روتے رہے، اور یہ دعا کرتے رہے کہ یا اللہ! وہ وقت کب آئے گا جب مکہ مکرمہ کے پہاڑ میری آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔ مگر کبھی بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ آؤ میں تمہیں مسجد حرام میں نماز پڑھواؤں۔ لیکن آج کے پیر صاحب یہ کہتے ہیں کہ جو شیخ تمہیں مسجد حرام میں نماز نہ پڑھوا دے، وہ شیخ بنائے جانے کا اہل ہی نہیں۔ چونکہ لوگ ظاہری چیزوں کے پیچھے چلنے کے عادی ہیں، لہٰذا جب کسی شخص کے اندر یہ ظاہری چیزیں دیکھتے ہیں تو اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں، حالانکہ نیکی، عبادت اور تقدّس اور تقویٰ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ تصرفات ہیں، جس کے لئے مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں، غیر مسلم بھی یہ تصرفات کرتے ہیں۔ لیکن آج کل لوگوں نے انہی تصرفات کو نیکی اور تقویٰ کے لئے معیار بنالیا ہے۔

بہتّر فرقوں میں صحیح فرقہ کون سا ہوگا

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ہمارے لئے ایک معیار بیان فرمادیا ہے کہ میری امّت میں سترّ سے زیادہ فرقے ہو جائیں گے، کوئی

فرقہ کسی چیز کی طرف بلائے گا، دوسرا فرقہ دوسری چیز کی طرف بلائے گا۔ ایک فرقہ کہے گا کہ یہ بات حق ہے۔ دوسرا فرقہ کہے گا کہ یہ بات حق ہے۔ اور یہ فرقے لوگوں کو جہنّم کی طرف دعوت دیں گے۔ یہ سب راستے ہلاکت کی طرف لے جانے والے ہیں، صرف ایک راستہ نجات دلانے والا ہے، یہ وہ راستہ ہے جس پر میں ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں بس، اس راستے کو مضبوطی سے تھام لو۔

خلاصہ

لہذا جب کسی کو مقتدا بنانے کا ارادہ کرو تو پہلے یہ دیکھو کہ اتباع سنّت اس کے اندر کس قدر ہے؟ اور قرآن وسنّت پر کس درجے میں عمل کرتا ہے؟ اور اس معیار پر وہ پورا اترتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے تو بیشک اس کی اتباع کرو، اور اگر پورا نہیں اترتا تو وہ مقتدا بنانے کے لائق نہیں، لہذا اس سے دور رہو، چاہے کتنے ہی شعبدے اور تماشے دکھادے، اور وہ تمہارے اوپر چاہے کوئی تصرف کر دے، لیکن تم اس کے پیچھے چلنے سے پرہیز کرو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت کا راستہ عطا فرمائے۔ اور گمراہی سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

❁❁❁❁❁

ایثار و قربانی کی فضیلت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ایثار و قربانی کی فضیلت

الحمد للّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده اللّٰه فلا مضلّ له ومن يضلله فلا هادى له، ونشهد أن لا اله إلا اللّٰه وحده لا شريک لهٗ، ونشهد أن سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسولهٗ، صلى اللّٰه تعالٰى عليه وعلٰى اٰله وأصحابه وبارک وسلم تسليمًا كثيرًا كثيراً۔

امابعد!

﴿عن انس رضى اللّٰه تعالٰى عنه أن المهاجرين قالوا: يارسول اللّٰه! ذهبت الانصار بالاجر كله، قال: لا، مادعوتم اللّٰه لهم واثنيتم عليهم﴾

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی شکر المعروف صفحہ ۳۰۶)

انصار صحابہ نے سارا اجر و ثواب لے لیا

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئے تو انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو مدینہ منوّرہ کے انصاری صحابہ ہیں، سارا اجر و ثواب وہ لے گئے اور ہمارے لئے تو کچھ بچا ہی نہیں۔ جواب میں آپ

نے فرمایا: نہیں، جب تک تم ان کے لئے دعا کرتے رہو گے اور ان کا شکر ادا کرتے رہو گے، اس وقت تک تم ثواب سے محروم نہیں رہو گے۔

جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے آکر مدینہ منورہ میں آباد ہونا شروع ہوئے تو اس وقت آباد کاری کا بہت بڑا مسئلہ تھا، اور لوگوں کا ایک سیلاب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ منتقل ہورہا تھا، اور اس وقت مدینہ منورہ ایک چھوٹی سی بستی تھی، اب آباد ہونے والوں کو گھر کی ضرورت تھی، ان کے لئے روزگار چاہئے تھا، اور ان کے لئے کھانے پینے کا سامان اور ضروریات زندگی چاہئے تھیں۔ یہ حضرات جب مدینہ منورہ آئے تو خالی ہاتھ آئے تھے، مکہ مکرمہ میں ان کی زمینیں تھیں، جائیدادیں تھیں، سب کچھ تھا، لیکن وہ سب مکہ مکرمہ میں چھوڑکر آئے تھے۔

انصار کی ایثار و قربانی

اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کے انصار صحابہ کے دل میں ایسا ایثار ڈالا اور انہوں نے ایثار کی وہ مثال قائم کی کہ تاریخ میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ انصاری صحابہ نے اپنی دنیا کی ساری دولت مہاجرین کے لئے کھول دی۔ یہ سب خود اپنی طرف سے کیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم نہیں دیا تھا، بلکہ انصاری صحابہ نے کہا کہ جو بھی مہاجر صحابی آرہے ہیں، ان کے لئے ہمارے گھر کے دروازے کھلے ہیں، وہ آکر ہمارے گھروں میں آباد ہوجائیں۔ وہ ہمارے مہمان ہیں، ان کے کھانے پینے کا انتظام ہم کریں گے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ جذبہ دیکھ کر مہاجرین اور انصار کے درمیان "مواخات" (بھائی چارہ) قائم فرمادیا، یعنی ہر ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی بنادیا۔ اب وہ اس کے ساتھ رہنے لگا، اسی کے ساتھ کھانے پینے لگا، یہاں تک کہ بعض انصاری صحابہ نے فرمایا کہ میری دو بیویاں ہیں، میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ میں اپنی ایک بیوی سے دست بردار ہوجاؤں اور اس کو طلاق دے کر علیحدہ کردوں، پھر تمہارے ساتھ اس کا نکاح کردوں۔ اگرچہ

ایسا واقعہ پیش نہیں آیا لیکن آمادگی ظاہر کی۔

انصار اور مہاجرین میں مزارعت

یہاں تک کہ ایک مرتبہ انصاری صحابہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے جو مہاجر بھائی ہیں، وہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں، اگرچہ ہم ان کو مہمان کے طور پر رکھے ہوئے ہیں، لیکن ان کے دل میں ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ ہم تو مہمان ہیں، اور یہاں ان کا باقاعدہ روزگار کا انتظام بھی نہیں ہے، اس لئے ہم نے آپس میں یہ طے کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں ہماری جتنی جائیدادیں ہیں، ہم آدھی آدھی آپس میں تقسیم کرلیں یعنی آدھی جائیداد مہاجر بھائی کو دے دیں اور آدھی جائیداد ہم رکھ لیں۔ تو اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجر صحابہ سے مشورہ کیا کہ انصاری صحابہ یہ پیش کش کررہے ہیں۔ آپ حضرات کا کیا خیال ہے؟ اس پر مہاجرین صحابہ نے فرمایا کہ نہیں، ہمیں یہ پسند نہیں کہ ہم ان کی آدھی زمینیں لے لیں۔ اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا تم انصاری صحابہ کی زمینوں پر کام کرو اور جو پھل اور پیداوار ہو وہ تم دونوں میں تقسیم ہوجایا کرے۔ چنانچہ مہاجر صحابہ انصاری صحابہ کی زمینوں پر کام کرتے تھے اور جو پھل اور پیداوار ہوتی وہ آپس میں تقسیم کرلیا کرتے تھے۔ اس طرح مہاجرین نے اپنا وقت گزارا۔

صحابہؓ کے جذبات دیکھئے

حضراتِ انصار نے ایثار کی وہ مثالیں پیش کیں جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ بہرحال، مہاجر صحابہ کرام نے جب یہ دیکھا کہ سارے ثواب والے کام تو انصاری صحابہ کررہے ہیں، اور سارا ثواب تو وہ لے گئے، تو ایک مرتبہ یہ حضرات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم! مدینہ منورہ کے جو انصاری صحابہ ہیں وہ سارا ثواب لے گئے، ہمارے لئے تو کچھ بچا ہی نہیں۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ انصاری صحابہ کے جذبات کیا ہیں اور مہاجرین صحابہ کے جذبات کیا ہیں۔ ایک طرف انصاری صحابہ مہاجرین کے لئے دیدۂ دل فرش راہ کئے ہوئے ہیں اور دوسری طرف مہاجرین صحابہ کو یہ خیال ہورہا ہے کہ سارا اجر و ثواب تو انصاری صحابہ کے پاس چلا گیا، اب ہمارے اجر و ثواب کا کیا ہوگا؟

تمہیں بھی یہ ثواب مل سکتا ہے

جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا، مادعوتم اللّٰہ لھم واثنیتم علیھم" یعنی تم یہ جو کہہ رہے ہو کہ سارا ثواب انصاری صحابہ لے گئے تو ایک بات سن لو! وہ یہ کہ یہ مت سمجھو کہ تمہیں کچھ ثواب نہیں ملا، بلکہ یہ ثواب تمہیں بھی مل سکتا ہے۔ جب تک تم ان کے حق میں دعائیں کرتے رہو گے اور ان کا شکر ادا کرتے رہو گے، اس وقت تک تم ثواب سے محروم نہیں ہوگے اور اس عمل کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کے ثواب میں تم کو بھی شریک کرلیں گے۔

یہ دنیا چند روزہ ہے

وہاں یہ نہیں تھا کہ مہاجرین اپنے لئے "انجمن تحفظ حقوق مہاجرین" بنالیں، اور انصار اپنے لئے "انجمن تحفظ حقوق انصار" بنالیں، اور پھر دونوں انجمنیں اپنے اپنے حقوق کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوجائیں کہ انہوں نے ہمارے حقوق پامال کردیئے، بلکہ وہاں تو الٹا معاملہ ہورہا ہے اور ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ میں اپنے بھائی کے ساتھ کوئی بھلائی کروں۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ اس لئے تھا کہ سب کے پیش نظر یہ ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے ساتھ کیا حالات پیش آنے والے ہیں۔ یہ دنیا تو چند روزہ ہے، کسی طرح گزر جائے گی، اچھی گزر

جائے یا تھوڑی تنگی کے ساتھ گزر جائے لیکن گزر جائے گی۔ البتہ اصل بات یہ ہے کہ مرنے کے بعد جو حالات پیش آئیں گے، اس وقت ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہو گا؟ اس فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایک کے دل میں دوسرے بھائی کے لئے ایثار تھا۔

آخرت پیش نظر ہو تو

جب انسان کے پیش نظر آخرت نہیں ہوتی، دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس نہیں ہوتا، تو پھر آدمی کے پیش نظر صرف دنیا ہی دنیا ہوتی ہے، اور پھر ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ دوسرے شخص نے مجھ سے زیادہ دنیا حاصل کرلی، میرے پاس کم رہ گئی، تو آدمی پھر اس وقت اس ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ میں کسی طرح زیادہ کمالوں اور زیادہ حاصل کرلوں۔ لیکن اگر آدمی کے دل میں یہ فکر ہو کہ آخرت میں میرے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے، اور ساتھ میں یہ خیال ہو کہ حقیقی راحت اور خوشی روپے میں اضافہ کرنے اور بینک بیلنس زیادہ کرنے سے حاصل نہیں ہوگی، بلکہ حقیقی خوشی یہ ہے کہ انسان کے دل میں سکون ہو، انسان کا ضمیر مطمئن ہو، اس کو یہ خوف نہ ہو کہ جب میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جاؤں گا تو اپنے اس عمل کا کیا جواب دوں گا۔ اور حقیقی خوشی یہ ہے کہ آدمی اپنے مسلمان بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ لے، اس کا کوئی دکھ دور کردے، اس کی کوئی پریشانی رفع کردے۔ جب انسان کے دل میں اس قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں تو پھر انسان دوسروں کے ساتھ ایثار سے کام لیتا ہے۔

"سکون" ایثار اور قربانی میں ہے

اسلام کی تعلیم صرف اتنی نہیں ہے کہ بس دوسرے کے صرف واجب حقوق ادا کردیئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تعلیم اسلام نے دی ہے کہ دوسروں کے لئے ایثار کرو، تھوڑی سی قربانی بھی دو۔ یقین کریں کہ جب آپ دوسرے مسلمان

بھائی کے لئے قربانی دیں گے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں جو سکون، عافیت اور راحت عطا فرمائیں گے، اس کے سامنے بینک بیلنس کی خوشی ہیچ در ہیچ ہے۔ چونکہ ہم نے ایثار اور قربانی پر عمل چھوڑ رکھا ہے اور ہماری زندگی میں اب ایثار کا کوئی خانہ ہی نہیں رہا کہ دوسرے کی خاطر تھوڑی سی تکلیف اٹھالیں، تھوڑی سی قربانی دیدیں، اس لئے اس قربانی کی لذّت اور راحت کا ہمیں اندازہ ہی نہیں۔

ایک انصاری کے ایثار کا واقعہ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انصاری صحابہ کے ایثار کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾

(سورۃ الحشر)

یعنی یہ انصاری صحابہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے یہ خود حالت افلاس میں کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ وہ واقعہ آپ حضرات نے سنا ہوگا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مہمان ایک انصاری صحابی کے پاس آگئے، کھانا کم تھا، بس اتنا کھانا تھا کہ یا تو خود کھالیں یا مہمان کو کھلادیں۔ لیکن یہ خیال ہوا کہ اگر مہمان کے ساتھ ہم بیٹھیں گے اور اس کے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے تو اس کو اشکال ہوگا، اس لئے چراغ گل کردیا تاکہ مہمان کو پتہ نہ چلے، اور ظاہر ایسا کیا کہ وہ بھی ساتھ میں کھانا کھا رہے ہیں۔ اس پر قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی، یعنی یہ لوگ افلاس اور تنگ دستی کی حالت میں بھی دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا اس ایثار اور قربانی کی لذّت سے بھی ہمکنار ہوکر دیکھئے۔ دوسرے مسلمان بھائی کے لئے ایثار اور قربانی دینے میں جو مزہ اور راحت، لذّت اور سکون ہے، وہ ہزار بینک بیلنس کے جمع کرنے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ

علیہ وسلم نے انصار صحابہ اور مہاجرین کے درمیان یہی ایثار اور قربانی کا رابطہ قائم فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دوسروں کے لئے ایثار اور قربانی کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

افضل عمل کونسا؟

اگلی حدیث حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: اَیُّ الْاَعْمَالِ خَیْرٌ؟ یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں کون سے اعمال سب سے بہتر ہیں؟ جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا: "اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ وَ جِھَادٌ فِیْ سَبِیْلِہٖ" اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر عمل اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے، اور دوسرے اس کے راستے میں جہاد کرنا ہے۔ یہ دونوں افضل الاعمال ہیں۔ پھر کسی نے دوسرا سوال کیا کہ ای الرقاب افضل؟ یعنی کون سے غلام کی آزادی زیادہ افضل ہے؟ اس زمانے میں غلام اور باندیاں ہوا کرتی تھیں، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام اور باندیوں کو آزاد کرنے کی بہت فضیلت بیان فرمائی تھی۔ تو کسی نے سوال کیا کہ غلام آزاد کرنا تو افضل ہے، لیکن کون سا غلام آزاد کرنا زیادہ افضل ہے اور زیادہ موجبِ ثواب ہے؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جو غلام زیادہ قیمتی اور زیادہ نفیس ہے، اس کو آزاد کرنا زیادہ موجب اجر و ثواب اور زیادہ افضل ہے۔ پھر کسی نے سوال کیا کہ حضور! یہ بتائیے کہ اگر میں ان میں سے کوئی عمل نہ کرسکوں۔ مثلاً کسی عذر کی بناء پر جہاد نہ کرسکوں، اور غلام آزاد کرنے کا عمل تو اس وقت کرے جب آدمی کے پاس غلام ہو یا غلام خریدنے کے لئے پیسے ہوں، لیکن میرے پاس تو غلام بھی نہیں ہے اور پیسے بھی نہیں ہیں تو پھر میں کس طرح اجر و ثواب زیادہ حاصل کروں؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اس صورت میں تمہارے لئے اجر و ثواب حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص جو بگڑی ہوئی حالت میں ہو تو تم

طاس کی مدد کردو۔

دوسروں کی مدد کردو

مثلاً ایک شخص کسی مشکل میں مبتلا ہے، پریشانی کا شکار ہے، اس کی حالت بگڑی ہوئی ہے تو تم اس کی مدد کردو، یا کسی اناڑی آدمی کا کوئی کام کردو۔ آپ نے "اناڑی" کا لفظ استعمال فرمایا، یعنی وہ شخص جسے کوئی ہنر نہیں آتا، یا تو اس لئے کہ وہ معذور ہے یا اس کی دماغی صلاحیت اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال کر کے کوئی بڑا کام کر سکے، تو تم اس کی مدد کردو اور اس کا کام کردو، اس میں بھی تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا اجر و ثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نہ جانے کتنے بندے ایسے ہیں جو یا تو معذور ہیں، یا تنگدست ہیں، یا ان کے پاس کوئی ہنر نہیں ہے، کوئی ذہنی صلاحیت ان کے پاس نہیں ہے، تو اگر دوسرا شخص ان کی مدد کا کوئی کام کردے تو اس پر بھی اجر و ثواب ملے گا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ اگر تم جہاد نہیں کرسکتے تو یہ کام کرلو، اس سے پتہ چلا کہ اس کا ثواب بھی اللہ تعالیٰ جہاد کے قریب قریب عطا فرمائیں گے۔ انشاء اللہ۔

اگر مدد کرنے کی طاقت نہ ہو؟

ان صحابی نے پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر میں اتنا کمزور ہوں کہ اتنا عمل بھی نہ کرسکوں، یعنی میں خود ہی کمزور ہوں اور دوسرے کمزور کی مدد نہ کرسکوں تو پھر کیا کروں؟ اب آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات کا اندازہ لگائیے کہ آپ کے یہاں ناامیدی کا کوئی خانہ نہیں ہے، جو شخص بھی آرہا ہے اس کو امید کا راستہ دکھا رہے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس مت ہو جاؤ، اگر یہ عمل نہیں کرسکتے تو یہ عمل کرلو، اگر یہ عمل نہیں کرسکتے تو یہ عمل کرلو۔

لوگوں کو اپنے شر سے بچالو

بہر حال، آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر تم کمزور ہونے کی وجہ سے دوسروں کی مدد نہیں کر سکتے تو یہ ایک عمل کرلو کہ: "تَدَعُ النَّاسَ مِنَ الشَّرِ" لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ کرلو۔ یعنی اس بات کا اہتمام کرلو کہ میری ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ اس لئے کہ دوسروں کو اپنے شر سے محفوظ کرنا یہ تمہارا اپنے نفس پر صدقہ ہوگا، کیونکہ اگر تم دوسرے کو تکلیف پہنچاتے تو تمہیں گناہ ہوتا، اب تم نے جب اپنے آپ کو دوسروں کو تکلیف دینے سے بچالیا تو گویا کہ تم نے اپنے نفس کو گناہ اور عذاب سے بچالیا۔ لہٰذا یہ بھی ایک صدقہ ہے جو تم اپنے نفس پر کر رہے ہو۔

مسلمان کون؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے جو معاشرتی احکام اور معاشرتی تعلیمات ہیں، ان کی بنیاد یہی ہے کہ اپنی ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف ارشاد فرمایا "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده" یعنی مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ نہ زبان سے دوسرے کو تکلیف پہنچے، نہ ہاتھ سے دوسرے کو تکلیف پہنچے۔ لیکن یہ چیز اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کو اس کا اہتمام ہو اور جس کے دل میں یہ بات جمی ہوئی ہو کہ میری ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے کہ ؎

تمام عمر اس احتیاط میں گزری
آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

اپنی وجہ سے کسی پر بوجھ نہ پڑے، اپنی وجہ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کے بارے میں اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کم از کم آپ کی آدھی سے زائد تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے آپ سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچنے دو۔ اور پھر تکلیف صرف یہ نہیں ہے کہ کسی کو مار پیٹ دیا بلکہ تکلیف دینے کے بے شمار پہلو ہیں، کبھی زبان سے تکلیف پہنچ جاتی ہے، کبھی عمل سے تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے اپنے آپ کو اس سے بچاؤ۔

حضرت مفتی اعظمؒ کا سبق آموز واقعہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ آپ کو پہلے بھی سنایا تھا کہ مرض وفات جس میں آپ کا انتقال ہوا، اسی مرض وفات میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا، اور رمضان المبارک میں بار بار آپ کو دل کی تکلیف اٹھتی رہی اور اتنی شدّت سے تکلیف اٹھتی تھی کہ یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ آخری حملہ ثابت نہ ہوجائے۔ اسی بیماری میں جب رمضان المبارک گزر گیا تو ایک دن فرمانے لگے: ہر مسلمان کی آرزو ہوتی ہے کہ اس کو رمضان المبارک کی موت نصیب ہو، میرے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کی موت عطا فرمادے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رمضان المبارک میں جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔ لیکن میری بھی عجیب حالت ہے کہ میں بار بار سوچتا تھا کہ یہ دعا کروں کہ یا اللہ! رمضان المبارک کی موت عطا فرمادے، لیکن میری زبان پر یہ دعا نہیں آسکی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں اپنے لئے رمضان المبارک کی موت طلب تو کرلوں، لیکن مجھے اندازہ ہے کہ

میری موت کے وقت میرے تیماردار اور میرے جو ملنے جلنے والے ہیں، ان سب کو روزہ کی حالت میں شدید مشقت اٹھانی پڑے گی، اور روزہ کی حالت میں ان کو صدمہ ہوگا، اور روزہ کی حالت میں تجہیز و تکفین کے سارے انتظامات کریں گے تو ان کو مشقت ہوگی۔ اس وجہ سے میری زبان پر یہ دعا نہیں آئی کہ رمضان المبارک میں میرا انتقال ہوجائے۔ پھر یہ شعر پڑھا ۔

تمام عمر اس احتیاط میں گزری
آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

چنانچہ رمضان المبارک کے ۱۱ دن کے بعد ۱۱ شوال کو آپ کی وفات ہوئی۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ جو شخص مرتے وقت یہ سوچ رہا ہے کہ میرے مرنے سے بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچے، اس شخص کا زندگی میں لوگوں کے جذبات کا خیال رکھنے کا کیا عالم ہوگا؟

تین قسم کے جانور

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تین قسم کے جانور پیدا کئے ہیں۔ ایک قسم کے جانور وہ ہیں جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، تکلیف نہیں پہنچاتے، مثلاً گائے ہے، بھینس ہے، بکری ہے، تم ان کا دودھ استعمال کرتے ہو، اور بالآخر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت کھا جاتے ہو۔ گھوڑا ہے، گدھا ہے، تم ان پر سواری کرتے ہو۔ دوسری قسم کے جانور ایسے ہیں جو دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، جیسے سانپ بچھو ہیں، درندے ہیں۔ یہ جانور انسان کو تکلیف پہنچاتے ہیں، فائدہ نہیں پہنچاتے۔ تیسری قسم کے جانور وہ ہیں جو نہ تو انسان کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہ ہی تکلیف دیتے ہیں۔ اس کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ انسانوں سے مخاطب ہو کر فرمارہے ہیں: اے انسان! اگر تم ایسے جانور نہیں بن سکتے

جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں تو کم از کم ایسے جانور بن جاؤ جو نہ فائدہ دیتے ہیں نہ تکلیف دیتے ہیں۔ خدا کے لئے ایسے جانور مت بنو جو دوسروں کو تکلیف ہی پہنچاتے ہیں، فائدہ کچھ نہیں پہنچاتے۔ یعنی کم از کم تم اپنے شر سے لوگوں کو محفوظ کرلو۔ اور یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

اجمالی فہرست

اصلاحی خطبات مکمل

جلد اول (۱)

عنوان صفحہ نمبر

جلد دوم (۲)

جلد سوم (۳)

جلد چہارم (۴)

جلد پنجم (۵)

جلد ششم (۶)

جلد ہفتم (۷)

جلد ہشتم (۸)

جلد نہم (۹)